سہ ماہی

کاروان ادب

جلد نمبر-۲۴ | جنوری، فروری، مارچ ۲۰۱۸ء | شمارہ نمبر-۴

مجلس مشاورت

● مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ● مولانا حافظ فضل الرحیم ● ڈاکٹر محمود الحسن عارف ● مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرف عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر مسئول

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

مدیر معاون ڈاکٹر تابش مہدی

مجلس ادارت

● مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ ● ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ ● ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی ● مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۵۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۲۰۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

فہرست

پیغام	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
اداریہ	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	۴
مشمولات کا تعارف	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	۷
نعت	خالد علیم	۹

مقالات

اردو زبان کے ارتقا میں دکن کا حصہ	مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی	۱۰
ولی دکنی کی شاعری - امتیازات و خصوصیات	مولانا اقبال احمد ندوی	۱۲
سراج اورنگ آبادی کی شاعری میں حمد و مناجات کا پہلو	ڈاکٹر سید عمر فاروق قاسمی	۲۰
اردو زبان کے امتیازات	پروفیسر ظفر احمد صدیقی ندوی	۲۷
تاج الدین اشعر کا شعری مجموعہ "داشگاف"	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	۴۵
مولانا محمد حنیف ندوی	مولانا محمد علاء الدین ندوی	۴۹
اردو زبان و ادب اور مدارسِ عربیہ	ڈاکٹر تابش مہدی	۵۹

شعریات

غزل	گلنار آفریں	۷۴
غزل	عزیز بگھروی	۷۵
غزل	حکیم افتخار فخر	۷۶
غزل	عرشی بھوپالی	۷۷

افسانہ

"یہاں اور وہاں" (اسلامی افسانہ)	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	۷۸

پیغام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

اسلام کی آمد سے قبل عربوں میں شاعری کا عام رواج تھا، جس کے ذریعے وہ اپنے دلوں کے احساسات مؤثر انداز سے ظاہر کرتے تھے اور دوسروں کے احساسات ابھارنے کے لیے اسے ذریعہ بناتے تھے۔ بعض وقت اُن کی اس سلسلے کی ہنرمندی کا انقلابی اثر ظاہر ہوتا تھا اور متاثر ہونے والوں کی صورتِ حال میں تبدیلی بھی واقع ہوجاتی تھی۔ اس عہد کے یہ عرب پڑھے لکھے نہ تھے، اس کی بناپر علم کی لائن میں ان کی کوئی پیش رفت نہ تھی، وہ اس کی ضرورت بھی شعروشاعری سے پوری کرتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے عربوں کی زندگی کے طورطریق سے واقفیت کا ذریعہ ان کی شاعری بنی۔ اس بناپر "الشعر دیوان العرب" کا جملہ کہا گیا کہ شاعری عربوں کی زندگی کی تاریخ ہے۔

علمی لائن نہ ہونے کی بناپر عربوں نے نثر کو عام طور پر اپنی زندگی کا مؤثر ترجمان نہیں بنایا، لیکن جب اسلام آیا اور پہلی آسمانی وحی میں علم وقلم کا حوالہ دیا گیا اور خود کلامِ الٰہی جو عربوں کی استعمالی زبان کے اس انداز میں نازل ہوا جو انسانی تعبیر وزبان کا معجزانہ اسلوبِ بیان رکھتا ہے تو ان کے چوٹی کے ایک شاعر نے کہا کہ اب شاعری کیا کریں، قرآن کی موجودگی میں اس کا کیا فائدہ۔ قرآنِ مجید اور اس کے اسالیبِ بیان کا یہ اثر پڑا کہ شاعری سے نثر کی طرف توجہ کا سلسلہ شروع ہوگیا اور نثر ذریعۂ ابلاغ ہی نہیں؛ دلوں کی ترجمانی کرنے لگی۔

دلوں کی ترجمانی خواہ شاعری سے ہو یا نثر سے ہو، ادب کے لفظ سے ظاہر کی جاتی ہے، اس لفظ کے اصل معنی اخلاق واعمال کی شائستگی اور خوبی کے ہیں اور سنجیدہ انسانی نقطۂ نظر رکھنے والے ادب کے لفظ میں اس صفت کو انسانی اقدار کا تقاضا سمجھتے ہیں، لیکن انسانی اقدار کی پابندی کو جن افراد نے کلامِ انسانی کے پیروں کی زنجیر سمجھا، انہوں نے ادب کی کسی قید کو قبول کرنے سے صرفِ نظر کیا؛ بلکہ مزید آگے بڑھ کر اس کو غلامی سمجھا، چنانچہ ادب نے وہ آزادی اختیار کرنا شروع کردی جو بالکل بے لگام ہوگئی اور بتدریج ایسا حال بنادیا گیا جیسا کہ غسل خانے سے کوئی شخص بغیر کپڑے پہنے باہر آجائے اور گفتگو کرنے لگے۔

بہرحال ہم ارکانِ رابطہ ادبِ اسلامی جو اسلامی اقدار کو اعلیٰ انسانی اقدار کی حیثیت دیتے ہیں، ادب کو اس کے بنیادی مضمون کے لحاظ سے اس کی معیاری صفت کی طرف توجہ دلانے کے لیے "اسلامی" کی اصطلاح مناسب سمجھتے ہیں، جس سے ادب کے باادب اور انسانی اقدار کا پابند ہونے کی راہ بحال ہوسکے اور الحمدللہ یہ کوشش پسند کی جارہی ہے اور ہمارا رابطہ ادبِ اسلامی کا یہ سفر الحمدللہ رواں دواں ہے۔

☆☆☆☆

(اداریہ)

ادبِ اسلامی کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اردو زبان ایسی ہی دلکش ہے جیسے تاج محل۔ ہندوستان کی زبانوں میں اردو زبان کو وہی حیثیت حاصل ہے جو تعمیرات کی دنیا میں تاج محل کو حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب تاج محل کی حیثیت کو ختم کرنے کی نامحمود کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن کوئی بھی منصف مزاج اور عقلِ سلیم رکھنے والا شخص ایسی کوششوں کو معقول نہیں قرار دے سکتا ہے۔ بلکہ ایسی کوشش کرنے والے اس کی نظر میں نامعقول اور نامعتبر ٹھہرتے ہیں۔

اردو زبان کے حسن اور اس کی دلکشی اور اس کی اہمیت سے انکار کے لیے عقل وانصاف سے محرومی کی بہت بڑی مقدار درکار ہے۔ اردو زبان کا ایک تاریخ ساز کردار رہا ہے۔ اس نے اس ملک میں قومی یک جہتی کو فروغ دینے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ وطنِ عزیز سے محبت اس زبان کے ضمیر اور خمیر میں رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ ایک خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی پیدائش، اس کی نشو ونما، اس کی ترقی، اس کی بہار، اس کی گل پیرہنی اور عطر بیزی سب اسی ملک میں ہوئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس ملک میں اپنوں کے ساتھ بیگانوں کا اور پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ اس قومی وراثت پر فخر کرنے کے بجائے اسے نظر انداز کرنے اور اس کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کا رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

اردو کے ساتھ ناروا سلوک تو ''غیروں'' نے کیا تھا، لیکن یہی ناروا سلوک ''اپنوں'' نے ادبِ اسلامی اور اس کے روشن ستاروں کے ساتھ کیا ہے۔ ایک بہت بڑے ادیب اور مفکر نے کہا تھا کہ ''گلاب کا پھول اگر میکدے کے چمن میں کھلے تو اسے پھول کہا جائے اور اگر وہ مسجد کے صحن میں کھلے تو اسے پھول کے بجائے بنول کہا جائے، یہ بہت بڑی حق تلفی اور ناانصافی ہے''۔ بلاشبہ مسجد کے صحن میں بھی بہت بڑی تعداد میں شگفتہ، شمیم افزا، نکہت ریز اور عطر بیز پھول کھلے۔ لیکن تنقیدِ جدید کے اساطین نے ان کے ساتھ بے مہری اور ناقدری کا معاملہ کیا۔ کیونکہ یہ اسلام پسند ادیب اسلامی قدروں کو فوقیت دیتے تھے، یا انھیں قدرِ اعلیٰ خیال کرتے تھے۔ وہ نہ زیادہ سیکولر تھے اور نہ زیادہ ترقی پسند، نہ اشتراکیت کا دم بھرنے والے تھے اور نہ مغربی تہذیب پر فریفتہ تھے۔ جہاں تک فن کا سوال ہے، اس کے ادراک میں اور اس کے تقاضوں کو برتنے میں ان کے یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔

سطورِ بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ماہر القادری اردو شاعری اور اردو ادب کا

ایک نمایاں نام ہے۔ان کا ''سلام'' آج بھی ہزاروں لوگوں کو یاد ہے۔ یہ مقبولِ خواص وعوام ہے۔''سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی'' ممکن نہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ اور باذوق شخص ماہر القادری کے نام سے اور اس سلام سے اور ماہر القادری کے نعتیہ کلام سے واقف نہ ہو۔لیکن ہمارے تنقید نگاروں اور جدید ادب کے علم برداروں کی یہ کمزوری رہی ہے کہ ادب وشاعری کو دین داری کے ساتھ برسرِ مجلس دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔وہ کسی دین دار اور دین کے علم بردار ادیب اور شاعر کو شعروادب میں بڑا مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔بلکہ ان پر اپنی نگاہِ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہیں۔وہ نظر انداز کرتے ہیں اور تغافل وتجاہل سے کام لیتے ہیں۔ماہر القادری کا کلام کوئی انصاف پسند ناقد نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔مثال کے طور پر ان کی غزل کے یہ شعر دیکھیے:

خموشی پردہ دارِ راز بھی ہے
یہی ظالم مگر غماز بھی ہے
ادب ! اے جوشِ غم جوشِ تمنا
حریمِ دل حریمِ ناز بھی ہے
قفس کیا، اور قفس کی تیلیاں کیا
کسی میں جرأتِ پرواز بھی ہے
سکوتِ لالہ رنگ پر نہ جانا
اسی میں شعلۂ آواز بھی ہے

ان اشعار سے ماہر القادری ایک منجھے ہوئے غزل گو شاعر نظر آتے ہیں۔بیان کی صفائی اور زبان کی شگفتگی اور رعنائی اپنے شباب پر ہے۔لیکن یہ سب وہ کلام ہے جہاں تک نقادوں کی دور بینی اور خورد بین نظر نہیں پہنچتی ہے۔وہ شعرا پر پوری پوری کتاب لکھ دیتے ہیں، لیکن کبھی ان کے قلم پر ماہر القادری کا ذکر نہیں آتا جیسے ماہر القادری کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔جہاں تک صحتِ زبان وبیان کا تعلق ہے کم ہی نثر نگاران کی ہمسری کا دعوی کرسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے رسالے ''فاران'' میں کتابوں پر جو تبصرے کیے ہیں وہ اس دعوی کی دلیل ہیں۔انھوں نے بڑے پختہ کار اور شہرت یافتہ ادیبوں کی زبان میں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

یہ تو اسلامی ادب کے شعری سرمایے سے (جس میں ماہر القادری کا شعری سرمایہ بھی ہے) میں نے ایک مثال پیش کی ہے۔اب اسلامی ادب کے نثری سرمایے سے بھی ایک مثال لیجیے۔اردو میں فکشن یعنی افسانہ، ڈرامہ اور ناول سے متعلق بہت سی تنقیدی کتابیں لکھی گئی ہیں۔بہت سے معروف افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کا اس میں تذکرہ ملے گا۔مدحت ومنقبت کا بیان ہوگا اور ان کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جائیں گے۔لیکن ناول نگاروں کی صف میں آپ کو ''نسیم حجازی'' کا نام ڈھونڈھنے سے بھی نظر نہیں آئے گا۔نسیم حجازی تاریخی ناول لکھتے تھے۔انھوں نے مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے فن کے آئینے میں مسلمانوں کی غلطیاں بھی دکھانے کی کوشش کی اور وہ راستہ بھی اپنے فن کے ذریعے بتایا جس پر چل کر وہ پھر بامِ عروج تک پہنچ سکتے ہیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کو تاریخ رکھتے ہوئے ناول کی ہیئت میں پیش کیا۔انھوں نے اپنے فن کے لیے سارا مواد اسلامی تاریخ سے

لیا ہے۔انھوں نے مسلمانوں کے دورِ زریں کو اور عہدِ زوال کو ناول کے فن کے ذریعے پیش کیا ہے۔نسیم حجازی کے فن کو سمجھنے کے لیے ان کے ناول ''محمد بن قاسم'' اور ''آخری چٹان'' اور ''شاہین'' کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ان کا ناول ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' اورنگ زیب کے عہد کے بعد مسلم ہندستان کے نقطۂ زوال کی تصویر ہے۔نسیم حجازی کا طرزِ تحریر اردو کی بہترین نثر کی روایات کا امین ہے۔لیکن اردو کے ادیبوں اور نقادوں نے اسے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا۔اردو کے نقادوں کے یہاں قاضی عبدالستار کی اہمیت ہے، کیونکہ ان کے یہاں اسلامیت کی چھاپ نہیں۔وہ تاریخی ناول نگار ہیں، لیکن ان کے سامنے زندگی کا کوئی نظریہ اور نظام نہیں۔وہ جو کچھ لکھتے ہیں، زیبِ داستاں کے لیے لکھتے ہیں۔اس میں ان کا خونِ جگر اور دینِ اسلام سے وابستگی کا جذبہ نظر نہیں آتا ہے۔

اب ادب کی دنیا میں کوئی ماہر القادری اور نسیم حجازی نظر نہیں آتا ہے۔دینی مدارس کے طلبہ کو اردو ادب وانشا کی طرف توجہ کرنا چاہئے تاکہ ان کے اندر اردو کے اچھے شاعر، اچھے ادیب اور اچھے انشا پرداز پیدا ہوسکیں اور اردو ادب کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کرسکیں۔عام طور پر دینی مدارس میں ادب کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔اور جو طلبہ فارغ ہوکر نکلتے ہیں ان کی انشا بہت کمزور ہوتی ہے، املا تک درست نہیں ہوتی ہے۔حالی کی ''مقدمۂ شعروشاعری''، شبلی کی ''شعرالعجم''، مولانا آزاد کی ''آبِ حیات''، مولانا عبدالحی کی ''گل رعنا''، مولانا سید سلیمان ندوی کی ''نقوش سلیمانی''، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ''نقوشِ اقبال''، مولانا سید سلیمان ندوی کی ''یادِ رفتگاں'' اور رشید احمد صدیقی کی ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' اور ماہر القادری کے ''تبصرے'' اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''انشائے ماجدی'' اور مولانا آزاد کی ''غبارِ خاطر'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔مدرسے کی لائبریری میں ان مصنفین کی کتابوں کا موجود رہنا ضروری ہے۔فکشن میں نسیم حجازی کے ناولوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ان ادبی کتابوں کے مطالعے کے بعد وہ جس موضوع پر اظہارِ خیال کریں گے اس میں ادب کی چاشنی اور انشا کی شیرینی پیدا ہوجائے گی۔ان کتابوں کی تعبیرات اور جملوں پر غائرانہ نظر ڈالنی چاہیے تاکہ یہ تعبیرات حافظے کا حصہ بن جائیں۔

قرآنِ مجید اور حدیثِ نبوی ادب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔اس لیے ادب کی بڑی اہمیت ہے۔اسے نظر انداز کرنا یا اس سے صرفِ نظر کرنا بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کرنا ہے۔ادب سے ہی تحریر میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔کتنی کتابیں ہیں جو ادب وانشا سے عاری ہونے کی وجہ سے دنیا میں اپنا مقام نہیں بنا سکیں۔اور کتنی ہی کتابیں ہیں جو علمی اعتبار سے سقیم ہونے کے باوجود محض ادب اور انشا کی طاقت سے دنیا میں بہت مقبول ہوگئیں اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔جن طلبہ نے زبان وقلم سے کام لینے کا عزم کیا ہے انہیں ادب سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ادب کی دنیا میں بہت بڑا چیلنج ہے دینی مدارس کے طلبہ اور علما کے لیے۔اور انہیں اس چیلنج کو قبول کرنا چاہیے۔تاکہ ان کی تحریروں پر بے ذوقی اور بے رونقی کا کوئی شخص الزام عائد نہ کرسکے۔

☆☆☆☆☆

(اداریہ)

مشمولات کا تعارف

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

(۱) صدر رابطہ ادب اسلامی کا پیغام۔

(۲) ادب کے موضوع پر اداریہ فکر انگیز ہے۔ دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے مطالعے کے لائق ہے۔

(۳) مشمولات کا مختصر تعارف ہے۔

(۴) ایک پاکستانی خوش فکر شاعر خالد علیم کی یہ نعت ہے۔ شاعر کو زبان و بیان پر قدرت ہے اور اس کے دل میں عشقِ رسول (ﷺ) کی خوشبو اور نکہت ہے۔

(۵) ''اردو زبان کے ارتقا میں دکن کا حصہ'' یہ مضمون مشہور عالمِ دین مولانا تقی الدین ندوی کا ہے جن کی فنِ حدیث پر تحقیقی کتابیں ہیں۔ عربی کے علاوہ اردو زبان میں بھی ان کی بیش قیمت کتابیں ہیں۔ مضمون نگار نے اس مضمون میں دکن کی اردو خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ دکن کی خدمات بہت قابلِ قدر اور قابلِ فخر ہیں۔

(۶) ''ولی دکنی کی شاعری - امتیازات و خصوصیات'' مولانا اقبال احمد ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کا مضمون ہے۔ ولی دکنی کا شمار جنوبی ہند ہی نہیں بلکہ اردو کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے اردو غزل کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا اور نہ صرف مضامین کو وسعت دی بلکہ لسانی اعتبار سے بھی اردو کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس مضمون میں ان کی شعری خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۷) سراج اورنگ آبادی کی شاعری میں حمد و مناجات کا پہلو ایک قیمتی مضمون ہے۔ ڈاکٹر سید عمر فاروق قاسمی نے مضمون کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ حمد و مناجات اگر چہ قدیم ہے لیکن آج بھی ان میں تاثیر ہے اور دلوں کو تسخیر کرنے کی صلاحیت ہے۔

(۸) اردو زبان کی خصوصیات پر پروفیسر ظفر احمد صدیقی ندوی شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کا یہ اہم مضمون ہے۔ کاروانِ ادب اور رابطہ ادبِ اسلامی سے ان کا تعلق رہا ہے۔

اسلامیات کے علاوہ اردو ادب پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دیوانِ غالب کی شرح پر بھی ان کی کتاب ہے۔ اردو زبان ایک باثروت زبان ہے۔ اردو زبان کے امتیازات پر ان کا یہ مضمون ہے۔ یہ ان کا توسیعی خطبہ ہے جسے ترتیب و تہذیب کے بعد مضمون کی شکل دے دی گئی ہے۔

(۹) تاج الدین اشعرؔ اردو کے ممتاز شاعر ہیں۔ نعت گو بھی ہیں اور غزل گو بھی ہیں۔ ابھی حال میں ان کا شعری مجموعہ ''واشگاف'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون تاج الدین اشعرؔ کی شاعری اور ان کے مجموعۂ کلام سے متعلق ہے۔ مقصود تاج الدین اشعرؔ کی خوب صورت شاعری کی طرف اہلِ ادب کو متوجہ کرنا ہے۔ یہ مضمون اڈیٹر کے قلم سے ہے۔

(۱۰) ''مولانا محمد حنیف ندوی'' اس شمارے کا اہم مضمون ہے۔ مقالہ نگار ندوۃ العلما کے استاذ اور کئی وقیع کتابوں کے مصنف ہیں۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے نام اور کام کو عہدِ حاضر کے اہلِ قلم فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کی شدید ضرورت تھی کہ ان کی علمی خدمات کو اہلِ ذوق و نظر کے سامنے تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے اور ان کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔

(۱۱) ''اردو زبان و ادب اور مدارسِ عربیہ'' یہ ڈاکٹر تابش مہدی کا مفصل اور بصیرت افروز مقالہ ہے۔ اس میں انھوں نے مدارسِ عربیہ کی خدماتِ زبان و ادب کا تذکرہ کیا ہے۔ اس مضمون میں بہت سے ایسے نامور ادبا و شعرا کا تذکرہ بھی ملے گا جن کے بارے میں بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں کہ ان کا تعلق مدارسِ عربیہ سے رہ چکا ہے۔ اس اعتبارِ خاص سے یہ بہت اہم مقالہ ہے۔

(۱۲) مشمولات میں اس بار گلنار آفریں، عزیز بگھروی، حکیم افتخار فخر اور عرشی بھوپالی کی غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان میں غزلوں کا حسن جلوہ گر ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی ذہن و فکر رکھنے والوں کے یہاں بھی شعر گوئی کا کتنا اچھا سلیقہ موجود ہے۔

(۱۳) ''یہاں اور وہاں'' خالص اسلامی افسانہ ہے۔ افسانہ نگار ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کشمیری ہیں اور راجوری یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں استاذ ہیں۔ وہ بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

نعت

خالد علیم

مجھ سے لکھوائی ترے عشق نے مدحت تیری
ڈھل گئی شعر کے سانچے میں محبت تیری

دوست تو دوست، ترے خون کے پیاسوں کو بھی
اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے شفقت تیری

آدمیت کے سب آداب سکھا دیتی ہے
روحِ قرآن کا اعجاز ہے سیرت تیری

تیرا ہر قول حَکَم ہے، تری ہر بات سَنَد
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت تیری

تیری خوشبو سے معطّر ہے مرا دشتِ حیات
مرا سرمایۂ انفاس ہے نکہت تیری

میرے افکار کی دنیا ہو منور تجھ سے
میرے کردار میں رخشندہ ہو سیرت تیری

اس جہاں زار کے بھٹکے ہوئے انسانوں کو
لے گئی منزلِ وحدت پہ قیادت تیری

للہ الحمد کہ ہر بے سر و ساماں کے لیے
آخرت کا سر و ساماں ہے شفاعت تیری

ہے تمنا کہ ترے شہر کی گلیاں دیکھوں
مجھ کو لے جائے ترے در پہ عقیدت تیری

مجھ سے ہوگا نہ کبھی تیرے محاسن کا شمار
ماوریٰ ہے مرے ادراک سے عظمت تیری

کیوں نہ خالدؔ ہو سلاطینِ جہاں سے بیزار
اس کی دولت ہے فقط چشمِ عنایت تیری

(اداریہ)

اردو زبان کے ارتقا میں ''دکن'' کا حصہ

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
ناظم و بانی جامعہ اسلامیہ اعظم گڑھ

دکن لفظ کا اطلاق تو جنوبی ہند پر ہوتا ہی ہے لیکن اس میں ہند کے مغربی حصے یعنی مہاراشٹر اور گجرات کے علاقوں کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے، علامہ شبلی نعمانی نے ایک نظم میں بمبئی کو نازِ دکن سے تعبیر کیا تھا کہ:

ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے نازِ دکن
کہ ترے تاج میں ہے طرۂ سلطانی بھی

اسی طرح قدیم میسور اور آرکاٹ جو اب کرناٹک اور تامل ناڈو ہو چکے ہیں، لفظ دکن کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے، اور اردو زبان وادب کے ارتقا کی بحث میں تو بنیادی اور اہم کردار واقعی اس علاقے کا ہے جس کو تامل ناڈو کہا جاتا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا پر نظر رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ سابق ریاست تامل ناڈو کا پورا علاقہ اردو شعر وادب کے ارتقا میں اپنی جداگانہ شان اور ایک قابل فخر تاریخ رکھتا ہے۔

دکن کی یہ تاریخ قریب تین سو سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اردو زبان کے علم وعرفان کی اس دولت وثروت کی ایک وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ جنوب کا خطہ ہندستان کا وہ مبارک حصہ ہے جہاں صحابہ کرامؓ، تابعین و تبع تابعین کے وجود کی خوشبو ملتی ہے اور یہی خوشبو اور یہی نور بعد میں اردو زبان کی ابتدا اور پھر اس زبان میں شعر وادب وتاریخ میں ظاہر ہوا۔ سترہویں صدی میں شاہ سلطان ثانی آرکاٹی کی شخصیت نظر آتی ہے اور ان کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ دبستانِ دکن کے قادر الکلام غزل گو شاعر تھے جن کی قادر الکلامی کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کا غیر مطبوعہ دیوان ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب شمالی ہند میں اردو کا علم پوری طرح نہیں لہرایا تھا۔ بعد میں جب سید ابوالحسن قربی قادری ویلوری، علیم اللہ شاہ قادری، ذوقی ویلوری، علامہ محمد باقر آگاہ نائطی، سید محمد غوث آرکاٹی، نواب مستقیم جنگ، قاضی بدر الدولہ، نواب غلام نوث بہادر، شاکر وانمباڑی اور شمس العلما نواب عبدالرحمٰن شاطر جیسے اعلیٰ درجے کے علما، ادبا و شعرا نے دکن کی اردو تاریخ کو اس طرح روشن کیا کہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ روشنی اور تابانی، شمالی ہند کی تب و تاب سے کم نہیں۔ تامل ناڈو میں نعت گوئی کا ذکر اس کی ایک مثال ہے، کیسے کیسے نعتیہ قصائد اور مثنویات دکن میں اردو کے دور اول کی یادگار ہیں اور شمالی ہند پر اپنی فضیلت کی خود ہی شاہد عدل ہیں۔

لیکن اصل فضیلت قسامِ ازل نے دکن کے جس خطے کے

لیے بطورِ خاص مقدر کی وہ بلاشبہ حیدرآباد اور اس کی عدم المثال ریاست ہے۔ ریاستِ علم کا لقب یا خطاب اسی خطے کو زیب دیتا ہے۔ حیدرآباد نے ہندستان کی تہذیب و تمدن کو اپنا کر جس طرح ایک نئی وضع دار اور پاس دار اور امانت دار ثقافت کو فروغ دیا اور مشترکہ معاشرت اور اس کے نتیجے میں ایک مشترکہ زبان و ادب کو وسعت دی، وہ پورے ملک کے لیے رشک کے لائق بن گئی۔ کسی نے صحیح کہا کہ "دکن وہ نگینہ بن گیا جس کی چمک و دمک سے ہندستان کے ہر خطے نے اکتسابِ نور کیا اور دکن دیس سے ایسے ایسے جوہرِ قابل ابھرے جن کی فکر و دانش کے سہارے تہذیب و تمدن کے چمن زار پھلے پھولے اور ثقافت و انسانیت کے سمن زاروں میں بہاریں چھا گئیں"۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی اس برکت میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی وہ دعا اس طرح مقبول ہوئی کہ اب اس کے اثبات کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یہ دعا بہت مشہور ہے کہ:

مرا شہر لوگاں سو معمور رکھ
رکھیا جوں سمندر میں من یا سمیع

۱۷۶۷ء میں جب اورنگ آباد کی جگہ یہ شہر سلطنتِ نظامیہ کا پایہ تخت بنا، اس کے بعد کی تاریخ سلطنت ہی نہیں اردو زبان و ادب کے غیر معمولی ارتقا کی تاریخ ہے، جس میں حیدرآباد کی ہر گلی اور ہر کوچہ مصور کا شاہکار ورق بن گیا کہ جو شکل نظر آتی تصویر نظر آتی۔

ہم نے ایک جگہ حیدرآباد کے کتب خانوں کی دو فہرستوں کو دیکھا۔ ایک تو الفہرست جس کو مرزا سجاد بیگ پروفیسر نظام کالج نے مرتب کیا، بیس سال کی محنت کے بعد یہ فہرستِ کتب ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوئی، اس میں حیدرآباد کی سات ہزار کتابوں کا اندراج ہے۔ اور دوسری فہرست قاموس الکتب ہے اس میں گیارہ ہزار سے زیادہ کتابوں کا ذکر ہے، ان میں مخطوطات بھی ہیں اور مطبوعات بھی، مخطوطات کے ذخیرے کو نہایت قیمتی اور نایاب اس لیے کہا گیا کہ دکن کا مسلم اقتدار، شمالی ہند کے مقابلے میں زیادہ طویل ہے اور آخری دور ہی فروغِ ادب کا اصل زمانہ ہے، اس لیے دکن ہی میں اس کے سامان زیادہ ہوئے، دوسرے یہ بھی کہ دلی کی حکومتوں نے وسط ایشیا کے جن علمی نوادر کو حاصل کیا تھا، وہ زوالِ دہلی کے بعد بڑی تعداد میں دکن کی علم پرور سلطنت کی قدردانی کی وجہ سے حیدرآباد منتقل ہوئے۔ اور یہ بھی کہ حیدرآباد کے ہر علمی مرکز، خانقاہ اور امرا کے ایوانوں کی زینت، مخطوطات سے تھی۔ اس لیے بھی حیدرآباد کو علوم و فنون کی حفاظت اور پھر اردو میں ان کی اشاعت کی فضیلت حاصل ہوئی۔ یہاں حیدرآباد کی عربی خدمات کے ذکر کی گنجائش نہیں کہ بات اردو زبان و ادب کے ارتقا کی ہے، حیرت انگیز وہ فہرست ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآنیات، حدیث، تصوف، کلام، فلسفہ، مناظرہ، سیر، مناقب، اوراد و وظائف، تذکار و عزاداری، سفر نامہ اور شعر و ادب پر ہزاروں کتابیں ہیں جو ان اصحاب کے فکر و نظر اور قرطاس و قلم کا نتیجہ ہیں جن کا تعلق صرف حیدرآباد اور مملکتِ حیدرآباد سے ہے۔ ہمارے پیشِ نظر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی پاکستان کی شایع کردہ کتاب "مملکت حیدرآباد، ایک علمی، ادبی اور ثقافتی تذکرہ" ہے۔ یہ کتاب دکن اور حیدرآباد کی ان خدمات کا حیرت انگیز انکشاف ہے جو صرف اردو زبان کے تعلق سے ہیں۔

ولی دکنی کی شاعری

امتیازات وخصوصیات

اقبال احمد ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اگر ہم اردو زبان وادب کی نشو ونما وارتقا کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ تاریخی اعتبار سے اردو زبان کے قافلے کا سب سے پہلا پڑاؤ جنوبی ہند میں ہوا۔ جنوبی ہند اُس وقت اپنے وسیع تناظر میں حیدر آباد دکن اور تامل ناڈو وکرناٹک کے علاوہ گجرات اور مہاراشٹر کو بھی شامل تھا۔ جنوبی ہند میں جس وقت اردو شاعری کا آغاز ہوا، اس وقت شمالی ہند اُس سے خالی تھا۔ دکن میں اردو شاعری کے ابتدائی نمونے اِس حقیقت کے غماز ہیں کہ اس کا ہیولیٰ یہیں سے اٹھا تھا، خواہ اُسے کسی نام سے پکارا جائے، یہ اردو شاعری کا نقشِ اول ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

(دکن میں اردو ادب کا ارتقا- غلام شبیر رانا)

گیارہویں صدی ہجری میں جب یکے بعد دیگر نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں تو دکن کے صوبیدار اورنگ زیب عالمگیر نے اورنگ آباد کا شہر آباد کر کے اُسے اپنا صدر مقام قرار دیا، جس کی وجہ سے اورنگ آباد دہلی کے امرا وشعرا کا مرکز بن گیا اور گول کنڈہ اور بیجاپور کے اربابِ کمال نے بھی اورنگ آباد کا رخ کیا۔ اس دور کے شعرا میں محمود بحری اور عشرتی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کے بعد ہمیں شعرا کی فہرست میں ولی دکنی کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ چونکہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ولی دکنی کے بعد ہوا بلکہ ولی دکنی کا دیوان دیکھ کر ہی شمالی ہند میں اردو زبان میں شاعری کی تحریک ہوئی اور اس طرح شمالی ہند کی پوری اردو شاعری اپنی پیدائش کے لیے ولی دکنی کی مرہونِ منت ہے، اس لیے بعض ناقدین ولی دکنی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ کیونکہ دکن میں شاعری کا آغاز ولی دکنی سے بھی بہت پہلے تقریباً سوسوا سو سال پیشتر ہو چکا تھا۔ بقول مولانا عبدالسلام ندوی :

> ”عام روایتوں کے مطابق اردو شاعری کا آفتاب اسی زمانے (عہدِ عالمگیری) میں طلوع ہوا اور سب سے پہلے ولی دکنی پر اس کی شعاعیں پڑیں۔ لیکن محققین کے نزدیک اردو شاعری کی ابتدا اس زمانے سے بہت پہلے ہو چکی تھی اور ولی سے پہلے متعدد شعرا گزر چکے تھے، جن پر ولی کو صرف یہ تفوق حاصل تھا کہ وہ ان میں سب سے

زیادہ ممتاز تھے اور اسی امتیاز نے ان کو اردو شاعری کا موجد مشہور کردیا''۔

(عبدالسلام ندوی شعرالہند حصہ اول صفحہ۱۴-۱۵)

حکیم سید عبدالحی حسنی اپنی کتاب ''گلِ رعنا'' میں لکھتے ہیں:

''ناواقفیت کی وجہ سے عام طور پر یہ خیال چلا آتا ہے کہ ریختہ میں سب سے پہلے ولی نے دیوان مرتب کیا ہے۔اسی بنا پر مولوی محمد حسین آزاد نے اردو نظم کی اولیت کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا ہے اور اردو شاعری کی نسل کا آدم ان کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو میں ان کو وہ رتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو، فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو حاصل ہے۔ حالانکہ ان سے سوا سو برس پہلے ریختہ میں شاعری اِس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اُس میں بے تکلف دیوان مرتب ہونے لگے تھے۔محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دیوان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں۔ مولانا نصرتی کا دیوان مفقود ہے مگر زبیری نے بساتین السلاطین میں اس کا ذکر کیا ہے۔قصائد میں مولانا نصرتی کا قصیدہ میری نظر سے گزرا ہے جس میں تاریخ کتابت ۲۲ر محرم ۱۰۸۳ھ لکھی تھی اور قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ محمد عادل شاہ (متوفی ۱۰۶۳ھ) کے عہدِ حکومت میں تصنیف کیا گیا ہے''۔ (گل رعنا صفحہ۱۲۶)

چند سطروں کے بعد آگے لکھتے ہیں:

''غرض کہ اصنافِ سخن میں سے ہر ایک صنف ولی سے سو سوا سو برس پہلے ریختہ میں آچکی تھی مگر زبان کی حیثیت سے دستور کے موافق عالمِ طفولیت میں تھی۔ولی کے زمانے تک منجھتے منجھتے زیادہ صاف ہوگئی۔ولی، آزاد، سراج اور داؤد کے اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی زبان ایک ہے۔تاہم اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ولی اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور اس کے کلام کو قبولِ عام حاصل ہوجانا اس کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے''۔

(گل رعنا صفحہ۱۲۷)

یہی بات نورالحسن ہاشمی بھی کہتے ہیں:

''شمالی ہند میں ولی مشعلِ ہدایت بن کر آئے۔ ان سے پہلے بھی دکنی شعرا کی غزلیں یہاں آیا کرتی تھیں،لیکن زبان کی نامانوسیت کے باعث کبھی مقبولِ عام نہ ہوسکیں''۔

(مقدمہ کلیاتِ ولی، ماخوذ از مضمون ابوالکلام قاسمی مشمولہ ولی دکنی، تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر- صفحہ۵۵-۵۶)

نصیرالدین ہاشمی ولی دکنی کو اردو غزل کا باوا آدم تو نہیں، البتہ ''مجدد و مصلح'' ضرور کہتے ہیں۔چنانچہ وہ اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں لکھتے ہیں:

''یہ بات بالکل صحیح ہے کہ شمالی ہند میں ولی کے بعد ہی اردو شاعری کا عام طور سے آغاز ہوا اور

پھر اب تک جو شاعری دکن میں مروج تھی، اس کی بھی اصلاح ہوئی۔ مثنوی کے بجائے غزلوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ اس لحاظ سے ولی کے سر مجددی کا سہرا ضرور باندھا جاسکتا ہے"۔

(صفحہ ۳۰۱، ۳۰۲)

ولی دکنی کو بلاشبہ جنوبی ہند ہی نہیں بلکہ اردو کے عظیم شعرا میں شمار جاسکتا ہے۔ دکنی شعرا نے غزل کے ڈھانچے کو تو اپنایا لیکن اس کے مزاج سے پوری طرح شیر و شکر نہ ہوسکے۔ لیکن ولی نے لسانی اجتہاد سے کام لیتے ہوئے فارسی شاعری کا بغور مطالعہ کیا۔ غزل کے مزاج کو سمجھا اور فارسی شاعری سے استفادہ کرتے ہوئے اردو غزل کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ ولی نے نہ صرف مضامین کو وسعت دی بلکہ لسانی اعتبار سے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ولی کی شاعری میں زندگی سے بھرپور لب ولہجہ ملتا ہے جو ہمیں زندگی کی زرخیزی کا احساس دلاتا ہے۔ اس کا تصورِ حسن نشاطیہ لئے سے معمور ہے۔ لیکن یہ نشاطیہ انداز کبھی حد سے متجاوز نہیں ہوتا۔ ولی کی شاعری میں فطرت کا تمام حسن سمٹ کر آ گیا ہے۔

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کو
بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا
صنم مجھ دیدہ و دل میں گزر کر
ہوا ہے ، باغ ہے ، آبِ رواں ہے

ولی دکنی نے اردو غزل کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اُن کی شاعری میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں پہلو جلوہ گر ہیں۔ اُنھوں نے چار سو تہتر (۴۷۳) کے قریب غزلیں لکھیں جو تین ہزار دو سو پچیس (۳۲۲۵) اشعار پر مشتمل ہیں۔ ولی نے فارسی مضامین اور خیالات کو بڑی کامیابی سے اردو زبان کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اُن کے اِسی شعری رویے کے پیشِ نظر اُنھیں اردو غزل کے جدید اسلوب کا معمارِ اول سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ولی نے فارسی شاعری کے تخیل کی اساس پر اردو شاعری کی فلک بوس عمارت تعمیر کرنے کی خشتِ اول رکھی۔ ولی نے ۱۷۰۰ء میں سید ابوالمعالی کے ہمراہ دلی کا سفر کیا۔ یہاں ایک ملاقات میں شاہ سعداللہ گلشن نے ولی کے اسلوبِ شعر کو بہ نظرِ تحسین دیکھتے ہوئے ایک صائب مشورے سے نوازا :

"ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بے کار افتادہ اند، در ریختۂ خود بہ کار بہ بر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔

(گل رعنا: صفحہ ۱۲۵)

ولی دکنی نے شاہ سعداللہ گلشن کے مشورے پر عمل کیا اور اس کے بعد اُن کے اسلوب میں ایک واضح تبدیلی کے آثار نظر آئے۔ انھوں نے فارسی زبان کی شعری روایت سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہ بات اکثر ناقدین نے تسلیم کی ہے کہ ولی دکنی کے فکری، فنی اور لسانی تجربے اردو شاعری میں نئے امکانات تک رسائی حاصل کرنے میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ان سے مروج اسلوب کی یکسانی کا خاتمہ ہوا اور ندرت و تنوع پر مبنی نئے اسالیب شعر کی تخلیق کی راہ ہموار ہوئی۔ اس وسیع و عریض عالمِ آب و گل میں ہر جگہ موضوعات، مواد اور واقعات کا ذخیرہ قریب قریب ایک جیسا ہی ہوتا ہے لیکن اندازِ بیان اور پیرایۂ اظہار ہر جگہ الگ رہتا ہے۔ یہی منفرد

اسلوب کی پہچان ہے۔ ولی دکنی کی شاعری کا امتیازی پہلو اس کا منفرد لہجہ ہی ہے، جس نے اُن کی شاعری کی تاثیر کو چار چاند لگا دیے۔ محمد حسین آزاد نے ولی دکنی کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

"ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی"۔

(دکن میں اردو ادب کا ارتقا-غلام شبیر رانا)

عہدِ ولی کے دکن کے ریختہ گویوں کے اسلوب میں فارسی زبان کی شعری روایت کی تقلید، زبان و بیان کی سادگی، بے ساختگی اور سلاست شامل تھی۔ جنوبی ہند سے جانے والی شعری روایت نے شمالی ہند کے ادب پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ شمالی ہند کے ادب پر پہلے ہی سے فارسی زبان کے ادب کے اثرات موجود تھے۔ ولی دکنی کی دلی آمد سے ان میں زیادہ پختگی پیدا ہوئی۔ ولی دکنی نے فارسی زبان کی شعری روایت کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنی شاعری میں روبہ عمل لانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً:

چہرۂ گل رنگ و زلفِ موج زن خوبی منیں
آیت جنات تجری تحتھا الأنھار ہے

یٰسین و طٰہٰ و الضحیٰ نازل ہوئے تجھ شان میں
واللیل اور والشمس ہے تجھ زلف و مکھ کے درمیاں

ولی کے زمانے میں تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے اور خود ولی نے صوفیانہ مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اس لیے اُن کا کلام سراپا تصوف ہے۔ اُن کے کلام میں سلاست اور متانت پائی جاتی ہے۔ اُن کا دیوان اُس عہد کی منہ بولتی تصویر ہے۔ لطفِ زبان، سادگی، صفائی اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ (نصیر الدین ہاشمی-دکن میں اردو-ص ۳۰۲)

ولی دکنی کی شاعری میں حسن و جمال، عشق و محبت، سیاسی، مجلسی، معاشی اور معاشرتی معاملات کے بارے میں نہایت دردمندی اور خلوص سے اظہار کی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ صبر و تحمل اور توکل و قناعت کا دامن تھام کر آلامِ روزگار کے سامنے سینہ سپر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جس کے ماحول اور کثیف فضا میں اُن کی شاعری تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند ہے۔ دکن کی ہندی روایت جو سالہا سال سے دکن میں تخلیق ہونے والے ادب کا امتیازی وصف رہا، اُس نے فارسی زبان کے امتزاج سے ایک متنوع اسلوبِ شعر کی صورت اختیار کر لی اور یہ اسلوبِ شعر ولی دکنی کے ذریعے سے جب شمالی ہند میں پہنچا تو اسے بہت پذیرائی ملی۔ چند مثالیں:

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار میں

حق پرستی کا اگر دعویٰ ہے
بے گناہاں کوں ستایا نہ کرو

ملک ہرگز نہیں رہے آباد
تخت سیں جس کے شہریار گیا

باعثِ رسوائیِ عالم ولی!
مفلسی ہے، مفلسی ہے، مفلسی

طمع مال کی سر بہ سر عیب ہے
خیالاتِ گنجِ جہاں سرسوں ٹال

ولی کا تصورِ عشق پاکیزہ ہے۔ عشق کو وہ ہادی و رہبر تصور کرتے ہیں۔ محبوب کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف کرتے وقت سراپا نگاری میں دل چسپی لیتے ہیں۔

حسن تھا عالمِ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

ولی نے اپنے شاعرانہ کمالِ فن سے شعرا کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا۔ اُنھوں نے ولی کی غزلوں پر غزلیں بھی کہیں اور ولی کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ مثلاً میر، آبرو، حاتم اور دوسرے شعرا نے ولی کی عظمت کو تسلیم کیا۔ حاتم دہلوی نے کہا:

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہانِ سخن کے بیچ

خدائے سخن میر تقی میر نے ولی کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کو اپنا معشوق قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولی سے استفادہ کرنے والے شعرا کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ولی کا دیوان دیکھ کر ہی دہلی والوں کو اپنے مجموعے شائع کروانے کا خیال آیا۔ ولی نے کہا:

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا
شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا

ولی کی تقلید کرتے ہوئے اسی زمین اور قافیے میں فائز کہتے ہیں:

مجھ پاس کبھی وہ قد شمشاد نہ آیا
اس گھر منے وہ دلبر استاد نہ آیا
فائز

ولی کہتے ہیں:

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

اسی مضمون کو آبرو اس طرح ادا کرتے ہیں:

بے تابیِ دل آج میں دلبر سوں کہوں گا
ذرے کی تپش مہرِ منور سوں کہوں گا
آبرو

ولی کی ایک غزل کی زمین میں تو تین چار شاعروں نے غزلیں کہیں۔ ولی کا مطلع ہے:

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

اسی زمین میں تین شعرا نے اپنا اپنا مطلع کہا۔ ملاحظہ ہو:

جب سجیلے خرام کرتے ہیں
ہر طرف قتلِ عام کرتے ہیں
فائز

نازنیں جب خرام کرتے ہیں
تب قیامت کا کام کرتے ہیں
آبرو

خوش قداں جب خرام کرتے ہیں
فتنہ برپا تمام کرتے ہیں
یک رو

(دکن کی چند ہستیاں: رؤف خیر صفحہ ۱۱۹-۱۲۰ بتصرف یسیر)

ولی نے بعض خوبصورت تراکیب بھی رائج کیں۔ جیسے گوش کرنا، پنجۂ خورشید، خنجرِ خورشید، خنجرِ مژگاں کی باڑھ، غمزۂ آہو پچھاڑ، شیریں بچن، ساغرِ نین، آبِ نین وغیرہ وغیرہ۔ ان معاملات میں بھی بعض دہلوی شعرا نے ولی کا اتباع کیا ہے۔ ولی کے اجتہاد نے اجتہادات کے دروازے کھول دیے۔ اس طرح اردو کا ذخیرۂ الفاظ ولی کا مرہونِ منت ہے۔

ولی کے لب و لہجے کے اثرات اس دور کے شعرا تک ہی محدود نہ تھے۔ بلکہ بعد میں آنے والے شعرا کے کلام میں بھی ولی کے اشعار کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ولی کا شعر ہے:

ہوں گرچہ خاکسار ولے از رہِ ادب
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

میر نے اس لکیر کے مقابل یقیناً بڑی لکیر کھینچی ہے مگر اولیت تو ولی کو ہی رہے گی:

دور بیٹھا غبارِ میر اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا
میر تقی میر

ولی کے ایک شعر کے چراغ سے شاہ حاتم اور مرزا غالب دونوں نے چراغ جلائے ہیں:

اگرچہ ہر سخن تیرا ہے آبِ خضر سوں شیریں
ولے لذت نرالی ہے پیا تجھ لب کی گالی میں
ولی

حق میں عاشق کے تجھ لباں کے بچن
قند ہے، نے ہے، شکر ہے
شاہ حاتم

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
غالب

(دکن کی چند ہستیاں: رؤف خیر صفحہ ۱۲۱-۱۲۲ بتصرف یسیر)

خود ولی کو بھی اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ فخریہ کہتے ہیں:

پڑھتے ہیں ولی! شعر ترا عرش پہ قدسی
باہر ہے تری فکرِ رسا حدِ بشر سوں

اسی تفاخر کی حالت میں ولی نے اپنے کلام پر نگاہ ڈالی تو وہ مے دو آتشہ کا ایک ساغرِ لبریز نظر آیا جس کے نشے میں خود مستانہ وار پکار اٹھے:

یوں تجھ سخن میں نشۂ معنی ہے اے ولی!
جوں رنگ و بوئے مے سے لبریز ایاغِ گل

اور اس سرمستی میں ایک پوری غزل لکھ ڈالی جس میں شاعری کے ساتھ خود اپنی مدح بھی کی ہے، جس کے دو اشعار درجِ ذیل ہیں:

لفظِ رنگیں ہے مطلعِ انوار
نورِ معنی ہے آفتابِ سخن

عرفی و انوری و خاقانی
مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن
(شعرالہند حصہ اول-صفحہ ۲۱-۲۲)

جناب صادق اپنے مضمون ''ولی دکنی : 'تجھ سخن کا چراغ روشن ہے' میں لکھتے ہیں:

ولی کی غزلوں کے بیشتر مقطعے خاکساری اور انکساری کی بجائے خودستائی سے معمور ہیں۔ تاہم یہ مقطعے نری شاعرانہ تعلّی یا محض لاف وگزاف قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ ان مقطعوں میں ولی اپنے سامعین وقارئین کو بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنا دیوان جمع کرکے شاعروں میں نام کیا۔ ان کا ہر ایک شعر سو دفتروں کے برابر ہے۔ یہ دنیا میں ''فوائد الفواد'' ہے۔ بلند خیال لوگ ان اشعار کو پسند کرتے ہیں۔ یہ اس وضع کی تصنیف ہے کہ جو کوئی سنے گا آفریں کہے گا لیکن وہی آفریں بولے گا جو سخن داں ہے۔ ولی کا کلام شوق انگیز ہے اس لیے ہر دل عزیز ہے۔ اس سخن میں نشۂ معنی، رنگ وبو سے لبریز ایاغ گل کی مانند ہے۔ ان کے اشعار میں پرتگالی شراب کا اثر ہے جو اہلِ دل کو مست کردیتا ہے۔ یہ شعر پُر اثر ہیں، انھوں نے ہر ایک کے دل میں جاکر اثر کیا ہے۔ ولی کی زبان میں شیرینی ہے اور شعر کا اثر زہر کی طرح سریع ہے۔ ولی اگرچہ ملکِ دکن کا شاعر ہے لیکن وہ ایران اور توران میں مشہور ہے۔ جب سے اشعار کی شہرت ہوئی ہے عرب سے عجم تک سب ان کے مشتاق ہیں۔.....جن کو عاشقی مرغوب ہے وہ ولی کے اشعار پڑھتے ہیں۔ ولی بحرِ معنی کا غواص ہے۔ اس کے دل کے دریا سے بیش قیمت موتی نکلتے ہیں۔ اس کا سخن گوہرِ معنی ہے۔ ولی شعر کے فن میں سحر کرتا ہے۔ اس کے شعر میں بنگال کا طلسم ہے وغیرہ وغیرہ۔

(ولی دکنی: تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر صفحہ ۱۰۳)

ڈاکٹر شارب ردولوی ''مطالعۂ ولی: تنقید وانتخاب'' میں لکھتے ہیں:

''سادگی، روانی، رنگینی، سرخوشی، نشاطیہ کیفیت، تشبیہات واستعارات کی جدت، معنی آفرینی، تاثر وحسّیت، تنوع، رمزیت اور ہندوستانی عنصر و فارسی کا خوبصورت امتزاج ولی کا فن ہے جس سے ان کے کلام کا بیشتر حصہ روشن ہے''۔

(ولی دکنی: تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر-صفحہ ۱۵۸)

گزشتہ سطور میں ولی کے بہت سے اشعار پیش کیے گیے جن سے ان کے کلام کا رنگ واضح ہوجاتا ہے۔ مزید چند اشعار ملاحظہ کریں:

مت جا چمن موں لالہ بلبل پہ مت ستم کر
گرمی سوں تجھ نگہ کے گل گل گلاب ہوگا

مجکو ہوا ہے معلوم اے مستِ جامِ خونیں
تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سروِ عریاں کے حضور
خود بخود رسوا ہے اُس کو اور کیا رسوا کروں

ولی

آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کے ولی
سرو قد کو دیکھ کر سیرِ عالمِ بالا کروں

گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع
جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے

اے ولی رہنے کوں دنیا میں مقامِ عاشق
کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

تا حشر رہے بوئے گلاب اس کے عرق سے
جس بر منے یک بار وہ گل پیرہن آوے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو
کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یا رب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لے جاوے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں
دل بُری اختیار کھوتی ہے

''کاشف الحقائق'' میں امداد امام اثر کی اس جامع رائے پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

''غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجے کے شاعر تھے۔ جو غزل گوئی کے تقاضے تھے، ان سے ولی کو پوری اطلاع حاصل تھی۔ چنانچہ غزل گوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اس لیے ان کی غزل سرائی پُر تاثیر نظر آتی ہے۔ ولی کے کلام میں درد، سودا، میر، مصحفی، ذوق، ناسخ، آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے جو ہر نوع کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد کسی طرز کے کہلاتے ہیں درحقیقت اسی پیرِ طریقت کے مرید ہیں''۔

(ولی اردو کا چاسر: حنیف کیفی، مضمون مشمولہ ولی دکنی، تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر۔صفحہ ۵۳)

سراجؔ اورنگ آبادی کی شاعری میں حمد و مناجات کا پہلو

ڈاکٹر سید عمر فاروق قاسمی

اردو شاعری میں حمد و مناجات کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہر عہد کے شعرا کے کلام میں حمد و مناجات کے کچھ اشعار ضرور مل جاتے ہیں۔ مناجات کہتے ہیں اپنے احتیاجات کو عاجزی و انکساری کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں رونے اور گڑگڑانے کو۔ حمد و مناجات دونوں کا پیرایۂ بیان شعری ہے۔ دیگر اصناف کی طرح یہ بھی ردیف و قافیہ اور وزن و بحر کے پابند ہوتے ہیں۔ عبد و معبود کے رشتے کی بنیاد پر بندہ اپنے پالنہار کی خوشنودی کے لیے جو بھی نیک عمل کرتا ہے، وہ عبادت کے زمرے میں شامل ہے۔ اس مقالے میں ریاستِ دکن کے مشہور و معروف شاعر سراجؔ اورنگ آبادی کے شعری مجموعے میں حمد و مناجات کے پہلو کو اجاگر کرنے اور اس پر مختصراً روشنی ڈالنے کی کوشش اور سعی کی گئی ہے۔

دکنی شعرا میں ولیؔ کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر سراجؔ اورنگ آبادی ہیں۔ سراجؔ اورنگ آبادی کی پیدائش ۱۳؍صفر ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۹؍مارچ ۱۷۱۲ء بہ روز شنبہ اورنگ آباد کے سادات گھرانے میں ہوئی۔ ان کا پورا نام سراج الدین تھا اور تاریخی نام ''ظہور احمد'' ہے۔ ان کا تعلق مشائخ حسنی سادات سے ہے۔ اورنگ آباد میں ان کے آباء و اجداد سکونت پذیر تھے اور وہیں سراجؔ اورنگ آبادی کی پیدائش ہوئی۔ سراجؔ کے جد اعلیٰ ''سید محمد'' مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ سراج کے والد کا نام ''سید درویش'' تھا۔ یہ خاندان اپنے علم و فضل اور زہد و تقوی کے اعتبار سے مشہور تھا۔ سید درویش بھی اپنے وقت کے متقی بزرگوں میں سے تھے۔ سراجؔ کی تعلیم و تربیت کی طرف انھوں نے خاص توجہ کی۔ بارہ سال کی عمر تک سراجؔ کتبِ متداولہ پڑھ چکے تھے۔ بعد میں ان پر جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس جذب و مستی کے عالم میں فارسی کے اشعار ان کی زبان سے نکلنے لگے۔ یہ اشعار اگر جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم دیوان مرتب ہوسکتا ہے، لیکن ان میں اب صرف چند غزلیں ملتی ہیں۔ (بوستانِ خیال، ص:۸۰)

اورنگ آباد صوبہ مہاراشٹر کا ایک مشہور و معروف شہر ہے۔ ریاستِ دکن میں اس شہر کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اس شہر کو پہلے ولیوں، قلندروں اور مرشدوں کی بستی کہا جاتا تھا۔

یہاں کی سرزمین ہمیشہ سے ہی شعروسخن کے لیے بڑی زرخیز رہی ہے۔اورنگ زیب عالمگیر نے اس شہرکو اپنی سلطنت کا پایۂ تخت بنایا تھا۔ان کے دورِحکومت میں اس شہرکوعلم وفضل کے اعتبار سے مرکزی مقام حاصل تھا۔ بڑے بڑے شعرا و ادبا یہاں موجود تھے۔جگہ جگہ شعروسخن کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ شعروسخن کے شہ سواروں کی ان کے شایانِ شان قدر کی جاتی تھی ۔امراوصلحا کی محفلوں میں دل کھول کرانھیں دادوتحسین ملتی تھی۔ اس سرزمین نے بے شمارشعرااوادبا کوجنم دیا، ولی دکنی،سکندرعلی حیدر، بشیرنواز، شمس جالنوی اورعرفان پربھنوی جیسے شعرا اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔

جس ماحول میں سراج اورنگ آبادی نے آنکھیں کھولیں، وہ صوفیانہ ماحول تھا۔جگہ جگہ بیعت وطریقت، پیری و مریدی کی محفلیں لگتی تھیں۔ حال وقال کی گرما گرمی میں سراج نے پرورش پائی۔سراج اورنگ آبادی نے حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی اوران کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگیے ۔خلد آباد کے ایک مشہورصوفی شاہ برہان الدین کے آستانے پراکثر حاضر ہوتے اورعجیب عالمِ بیخودی میں آستانے کا طواف کیا کرتے تھے۔اس دوران ان کا شعری ذوق بھی پروان چڑھا۔انھوں نے صرف چارسال کی مدت میں مختلف اصنافِ سخن میں پانچ ہزاراشعار کہہ ڈالے جوان کے دیوان میں شامل ہیں۔طرزِ کلام میں انھیں ولی دکنی کا وارث اورقائم مقام سمجھا جاتا ہے۔

سراج اورنگ آبادی کا زمانہ افراتفری کا زمانہ تھا۔ مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی۔ دہلی حکومت کے خلاف بغاوتوں نے سراٹھایا تھا۔اورنگ زیب کے بعدان کے تینوں بیٹے معظم، اعظم اور کام بخش نے تختِ شاہی کے لیے خانہ جنگی شروع کردی اورآخرمیں معظم نے شاہ عالم بہادر کے نام سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ۔ ۱۷۳۸ عیسوی میں نادر شاہ نے ہندوستان پرحملہ کیا اورخون کی ندیاں بہادیں اورستر کروڑ کا سامان اور ہندوستان کا بے مثال تختِ طاؤس لیکرایران واپس ہوگیا۔۱۷۶۹ء میں احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا۔سارا ہندوستان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گیا۔کچھ علاقوں پرمرہٹوں کا قبضہ ہوگیا۔کچھ حصوں کوایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے زیرِنگیں کیا ۔انگریزحکومت رفتہ رفتہ مستحکم ہوتی گئی۔اس افراتفری کی وجہ سے دہلی کے عمائد میں میرقمرالدین خاں نظام الملک دکن چلے آئے اورسنہ ۱۱۳۶ھ میں ایک خودمختارحکومت قائم کی۔ نظام الملک آصف جاہ سے دکن کی آصف جاہی سلطنت کی بنیاد پڑی ،جس کا دارالحکومت اورنگ آباد ہی رہا۔شمالی ہند کے بہت سے بڑے شعرانے اورنگ آباد کارخ کیا۔اورنگ آباد میں شعروسخن کی رنگین اورحسین فضا پیدا ہوگئی۔اس کے نتیجے میں کئی خوش گو شعرا یہاں سے اٹھے۔سراج اورنگ آبادی بھی انھیں میں سے ایک ہیں اوران کی نشوونما اسی زمانے میں ہوئی۔

(بوستانِ خیال:ص:۴-۵)

سراج اورنگ آبادی نے بہت سی غزلیں بھی کہی

ہیں۔صوبۂ دکن میں اردو غزل کی نشو ونما کا سہرا ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے سر جاتا ہے۔سراج اورنگ آبادی کے کلام میں سادگی اور صفائی ہے،اور اسلوب بہت ہی پُر اثر اور دلکش ہے۔اسی اسلوب اور سادگیِ کلام کی وجہ سے وہ عوام و خواص میں بے حد مقبول ہوئے۔غزل گوئی میں ان کا اپنا انداز ہے جو بہت ہی منفرد اور جداگانہ ہے۔سراج اورنگ آبادی کو بچپن ہی سے تصوف کا ذوق تھا۔اہلِ دل اور اہل اللہ کی مجلسوں میں پابندی سے حاضر ہوتے اور ان سے کسبِ فیض کرتے۔وہ مجالسِ سماع کے دلدادہ تھے۔جب قوال ان کی غزلوں اور مثنویوں کو ساز و سر سے گاتے تو ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی۔

بیعت کے بعد ان کی توجہ تصوف کی طرف زیادہ ہوگئی،جس کا پرتو ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔سراج اپنے معاصرین میں بڑی عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔نوجوان شعرا اصلاح کی غرض سے ان کے گھر حاضر ہوتے۔ان کی قیام گاہ پر شعر وسخن کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔علما بھی حاضر ہوتے رہتے تھے۔آخری عمر میں سراج اورنگ آبادی نے صوفیوں کے مسلک کے مطابق ترکِ دنیا کر کے مکمل گوشہ نشینی اختیار کرلی۔۴رشوال ۱۱۷۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(بوستانِ خیال:۹)

سراج کے کلام میں حمد ومناجات

سراج اورنگ آبادی نے بہت سی مثنویاں لکھی ہیں۔ان کی شہرہ آفاق مثنوی ''بوستانِ خیال'' سنہ ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ عیسوی میں لکھی گئی ہے۔اس عرصے میں جو مثنویاں لکھی گئی ہیں،ان میں شعرا نے بالعموم تصوف اور اخلاقیات پر زور دیا ہے۔اور حسن و رومان اور رزم اور بزم کی شانِ دل ربائی قاری کو مسحور کردیتی ہے۔مثنوی ''بوستانِ خیال'' موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے شمالی ہند میں لکھی جانے والی مثنویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔اس مثنوی میں تخیل کی جولانیاں اور کمالِ فن کی رعنائیاں پائی جاتی ہیں۔

سراج اورنگ آبادی کا اسلوب مثنویوں میں بہت ہی جداگانہ ہے۔انھوں نے اپنی مناجات میں عام انداز سے بالکل جداگانہ انداز اختیار کیا ہے۔وہ خدا کی حمد وثنا بہت ہی عمدہ اور خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔وہ خدا کی برتری کا ذکر اور اس سے التجاء نجات کا ذکر کرتے ہیں۔معروف مثنوی ''بوستانِ خیال'' میں وہ اپنی مناجات بارگاہِ ایزدی میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

الٰہی بتوں سے مرا دل پھرا
کہ ہرگز نہیں ان میں نامِ وفا
مجھے ان کی زلفوں کی خم سے نکال
کہ آئے گا ایماں پہ آخر وبال
چھڑا دامِ گیسوئے خوباں سے دل
بچا خنجرِ نوکِ مژگاں سے دل

مجھے دور رکھ ان کے ابر و ستی
بچا رکھ مجھے چشمِ جادو ستی
مت ان جامہ زیبوں سے اٹکا مجھے
نہ دے ان کے دامن کا جھٹکا مجھے
تبسم انھوں کا مجھے مت دکھا
تکلم انھوں کا مجھے مت سنا
پھرا حسنِ حادث سے دل یک بیک
کہ نورِ قدیمی کی دیکھوں جھلک

ان اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں مناجات کا کس قدر وصف شامل ہے۔ ان کے کلام میں تمام مناجاتی خصوصیات کارفرما ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سراج اورنگ آبادی اردو کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ اپنی شاعری میں مناجات کو رواج دیا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک مثنوی کا نام ہی ''مناجات'' رکھا ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے مناجات کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بعض غزلوں میں بھی انھوں نے مناجاتی فکر استعمال کی ہے جو قاری کو بے انتہا متاثر کرتی ہے۔ مثنوی بوستانِ خیال کے اختتامیہ کا عنوان انھوں نے ''مناجات بہ حضرت ذوالجلال وختم بوستانِ خیال'' رکھا ہے۔ اس مثنوی کے اشعار میں وہ مختلف وسیلوں سے مناجات کرتے نظر آتے ہیں:

بحق جنابِ رسولِ کریم
کہ برحق ہے محبوب تیرا قدیم
بحق علی شاہِ دلدل سوار
وصی نبی صاحبِ ذو الفقار
بحق حسن سرو سرسبزِ دیں
کہ ہے نونہالِ بہشتِ بریں
بحق حسینِ شہہِ کربلا
شہیدِ سرِ خنجرِ اشقیا
بحق دل پاک زین العباد
کہ نیں ماسوا جس کو اللہ کے یاد
بحق بہارِ گلِ جعفری
کہ گلبنِ گلشنِ سروری
بحق شہِ کاظم با صفا
جماعت میں ایماں کے ہے مقتدا
بحق رضاہ شاہِ محشر پناہ
خراسانِ قدرت کا ہے کج کلاہ
بحق تقی کانِ برجِ کمال
نمایاں نبی کا ہے جس میں جمال
بحق امامِ حسن عسکری
چراغِ شبستانِ نیک اختری
بحق شہ مہدیِ نیک نام
کہ قائم ہے آلِ محمد سدام

ان اشعار میں سراؔج اورنگ آبادی نے بارہ اماموں کے واسطوں سے مناجات کی ہے۔ان مناجات میں شجرۂ عالیہ کی خصوصیات شامل کی ہیں۔کلیاتِ سراؔج میں بھی کئی اشعار ہیں جن میں حمد و مناجات کا پہلو پایا جاتا ہے۔ کلیاتِ سراؔج مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے صفحہ ۲۵۳ پر مناجات کے زیرِ عنوان ایک نظم پیش کی گئی ہے۔اس میں یادِ الٰہی کے علاوہ خداوندِ قدوس سے مدد طلب کرنے کا ان کا انداز بہت ہی جداگانہ ہے۔ان کے کلام میں سوز وگداز کے ذریعے تاثیر پیدا کرنے والے تمام ہی عناصر پائے جاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

الٰہی مجھ کوں دردِ لا دوا دے
مجھے توفیقِ عشقِ بے ریا دے
الٰہی شوق کی آتش عطا کر
جلا کر خاک کر لا کر فنا کر
الٰہی عشق کی مے کا پلا جام
مجھے بے ہوش رکھ ہر صبح و ہر شام
الٰہی آہ کوں آتش فشاں کر
مرے آنسو کے پانی کوں رواں کر
الٰہی کر مجھے تو خسروئے غم
رواں کر جوئے شیر آنکھوں میں ہر دم
الٰہی شربتِ شیرینِ غم دے
طپش دے، داغ دے، درد و الم دے

یہ نظم مناجاتی طرز کے ساتھ کئی اشعار پر مشتمل ہے۔ سراؔج اورنگ آبادی نے بڑے درد کے ساتھ خداوند قدوس کے حضور مناجات پیش کی ہے اور دیدارِ الٰہی کی خواہش کرتے ہوئے آگے وہ مزید لکھتے ہیں:

الٰہی جلوۂ دیدار دکھلا
جمالِ مطلع الانوار دکھلا
الٰہی کر لبالب جام خالی
دکھا مجھ کو جمالِ لا یزالی
الٰہی بحرِ غم میں آشنا کر
مرے آنسو کوں درِ بے بہا کر
الٰہی مجھ کو دکھلا جلوۂ نور
مرا دل کر بہارِ شعلۂ طور
الٰہی غم میں جلتا ہے سراؔج آج
زُلالِ وصل کا ہے تیرے محتاج

ہر شاعر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کلام اور اس کی شاعری اثر انداز ہو۔لوگ اسے زیادہ سے زیادہ پسند کریں۔ اس کے اسلوب اور فکر سے لطف اندوز ہوں اور اس کے کلام کی شہرت چہار دانگِ عالم میں پھیل جائے۔سراؔج اورنگ آبادی نے اس نظم میں اللہ کے سامنے اپنے شعر وسخن اور اسلوبِ بیانی کو بین الناس مقبول ہونے کی التجا کی ہے۔وہ کلام میں لطافت اور معنی میں رنگین نزاکت چاہتے ہیں۔وہ اس طرح دست بدعا ہیں:

الٰہی دے مجھے رنگیں خیالی
سخن کے باغ کا کر مجھ کوں مالی
الٰہی شعر میرا درفشاں کر
لوئے صافی میں جیوں آب رواں کر
الٰہی تجھ ثنا میں ہوں غزل خواں
ہر اک مصرع کوں کر لعل بدخشاں
الٰہی کر عطا روشن بیانی
مرے اشعار کوں توں سے روانی
الٰہی دے سخن کی بادشاہی
خیال آباد کی دے کج کلاہی
الٰہی مجھ سخن میں دے لطافت
گلِ معنی میں دے نزاکت
الٰہی حمد تیری کا ہے مذکور
مری ہر بیت کر عالم میں مشہور
الٰہی شعر میرا دل نشیں ہوئے
نہالِ بوستانِ آفریں ہوئے
الٰہی ہر غزل مقبولِ جاں ہوئے
وظیفہ دل کا اور وردِ زباں ہوئے
الٰہی کر مرے دیوان کو مشہور
ہر اک صاحب نظر کو ہوئے منظور

سراجؔ کے اردگرد صوفیانہ ماحول تھا۔ وہ خود حضرت خواجہ سید شاہ عبد الرحمٰن چشتی کے حلقۂ ارادت سے وابستہ تھے۔ تصوف میں فنا فی اللہ کا درس دیا جاتا ہے۔ عشقِ خداوندی میں ڈوب جانے کا سبق پڑھایا جاتا ہے اور اس کی مشق بھی کرائی جاتی ہے۔ اسی لیے سراجؔ اورنگ آبادی اپنی مناجات میں سوزِ عشق اور غمِ دل مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ وہ اس طرح ناجی الی اللہ ہیں:

الٰہی عشق میں رکھ مجھ کوں بے تاب
مجھے کر عشق کی آتش میں سیماب
الٰہی کر مرے آنسو کو جاری
مجھے دے بے قراری آہ و زاری
الٰہی بحرِ غم میں آشنا کر
مرے آنسو کو دُرِّ بے بہا کر
الٰہی سوزِ عشقِ بے کراں دے
بہارِ گلشنِ آہ و فغاں دے

سراجؔ اورنگ آبادی نے اپنی مناجات میں بارہ اماموں کے علاوہ محمد (ﷺ) کے وسیلے کو بطورِ خاص جگہ دی ہے۔ چنانچہ مثنوی بوستانِ خیال کا تسلسل آگے اس طرح رواں ہوتا ہے:

یہی ورد میرا رہے صبح و شام
غلامی میں اون کی رہوں میں مدام
پھرا دل میرا صحبتِ غیر سے
کہ کعبے طرف جاؤں اب دیر سے

میں لایا ہوں تیری طرف التجا
طریقِ ہدایت مجھے اب بتا

سراجؔ اورنگ آبادی کے کلیات میں غزلیں، قصیدے، رباعیات اور مثنوی شامل ہے۔ ان کا سارا کلام ہی شعریت سے بھرپور ہے، لیکن جس مثنوی نے انھیں قبولیت اور اعجاز بخشا، وہ بوستانِ خیال ہے۔ اس مثنوی میں تقریباً ۱۱۶۰/ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی اپنی روانی، سادگی اور شدید عشقیہ کیفیات سے بھرپور ہے۔ ان کیفیات کے بے باکانہ اظہار کی وجہ سے پُراثر ہے۔ اس مثنوی میں سراجؔ اورنگ آبادی نے جو مناجاتی اشعار لکھے ہیں، ان میں زبان و بیان اور قوتِ اظہار کی تمام تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں سراجؔ نے جو مناجاتی اشعار ذکر کیے ہیں، ان میں زبان و بیان اور قوتِ اظہار بے انتہا عمدہ ہیں۔

سراجؔ کی شاعری میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا فلسفہ بھی ہے، اخلاق و حکمت کی باتیں بھی ہیں اور دنیا کی ناپائیداری کا ذکر بھی ہے۔ اس کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے:

شرابِ معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے
در و دیوار اس کوں مظہرِ محبوب ہوتا ہے

سراجؔ اورنگ آبادی نے اپنی مناجات میں سادہ، سلیس اور صاف لہجہ اپنایا ہے۔ وہ ہر موضوع پر بے تکلفی سے اظہارِ خیال کرنے پر قادر ہیں۔ ان کے اسلوب میں تصنع، ریاکاری نہیں پائی جاتی۔ راست گوئی اور زندہ و تابندہ خیالات ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ احساساتی کیفیات اور خیالات کو جس حسین پیرائے میں انھوں نے بیان کیا ہے، وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ سراجؔ اورنگ آبادی جو کچھ بھی شعر کہتے ہیں، وہ ان کی ذاتی فکر کا سرمایہ ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں ایک طرح کی ندرت ملتی ہے۔

☆☆☆

مراجع و مصادر:

۱- بوستانِ خیال، مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری
۲- انتخاب سراجؔ اورنگ آبادی، ڈاکٹر محمد حسن
۳- اردو ادب کی تاریخ، ڈاکٹر جمیل جالبی
۴- نقدِ شعر و ادب، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
۵- دکن میں اردو ادب کا ارتقا، غلام شبیر رانا

اردو زبان کے امتیازات

پروفیسر ظفر احمد صدیقی ندوی

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

علامہ اقبالؔ کے ان اشعار کے سنانے کا سبب یہ ہے کہ عام طور پر اردو کے طلبہ چاہے وہ ریسرچ کے طلبہ ہوں یا ایم اے کے طلبہ ہوں، یا ایم فل کے ہوں، وہ اپنے آپ کو دوسری زبانوں کے طلبہ کے مقابلے میں احساسِ کمتری میں مبتلا پاتے ہیں۔ میں نے آج کا یہ موضوع رکھا (اردو زبان کے امتیازات) تو اس کا منشا یہ بتانا ہے کہ جس زبان کے آپ طالبِ علم ہیں، وہ بہت ہی باثروت زبان ہے۔ ہمارے ملک کے موجودہ حالات اور کچھ تقسیم کے پہلے کے حالات، کچھ تقسیم کے بعد کے حالات کے نتیجے میں یہ باثروت زبان غربت زدہ زبان سمجھی جانے لگی۔ تو آج کی گفتگو میں آپ لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ ہماری زبان نہایت ہی باثروت، نہایت ہی طاقتور ہے۔ پھر ہمارے یہاں اردو میں ایک محاورہ استعمال ہوتا ہے (اپنے منھ میاں مٹھو بننا) تو ہم اپنی زبان کو جب یہ کہتے ہیں کہ بہت ہی باثروت ہے، بہت ہی عمدہ ہے، پُرشوکت ہے تو اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم محض دعوی کر لیتے ہیں اور خوش ہو لیتے ہیں۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ دوسری زبانوں سے ہم موازنہ بھی کر سکتے ہیں اور جاننا بھی چاہتے ہیں کہ صاحب ہماری زبان کے کیا امتیازات ہیں؟ کیا خوبیاں ہیں؟ تو اگر آپ دلائل کی روشنی میں اپنی زبان کی وقعت، اس کی قدر و قیمت کا علم ہو جائے تو آپ کے اندر اردو زبان سے وابستگی کی وجہ سے جو احساسِ کمتری ہے کہ صاحب ہم ایک بہت ہی غریب، پسماندہ زبان کے طالبِ علم ہیں، ریسرچ اسکالر ہیں، وہ کیفیت نکل جائے گی، وہ احساس دور ہو جائے گا۔ اسی لیے یہ گفتگو آپ کے سامنے کی جا رہی ہے۔

یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ ہماری اردو زبان کا تعلق جدید ہند آریائی زبانوں کے سلسلے سے ہے۔ جدید ہند آریائی

زبانوں سے مراد ملک کی وہ زبانیں ہیں جو جدید زبانیں کہلاتی ہیں (Modern Indian Languages) مثلاً بنگالی، پنجابی، تیلگو، مراٹھی وغیرہ وغیرہ۔ اسی سلسلے کی ایک زبان اردو بھی ہے۔ لیکن ان تمام زبانوں کے مقابلے میں اردو کو بعض امتیازات حاصل ہیں۔ وہ امتیازات کیا ہیں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ہندوستانی زبان ہے۔ اور کسی زبان کے ہندستانی یا غیر ہندستانی ہونے اور اس کے خاندان یا اس کے شجرۂ نسب کا پتا کیسے چلتا ہے؟ مثلاً بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ اردو ایک بدیسی زبان ہے۔ باہری زبان ہے۔ تو ہم اس کے مقابلے میں کیسے بتائیں کہ نہیں اردو ہندوستانی زبان ہے۔ تو اس کا ایک اصول بتایا گیا ہے کہ زبان کے کچھ عناصر ایسے ہوتے ہیں جو بنیادی ہوتے ہیں۔ ایک سانچہ ہوتا ہے، ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں اوپر سے گوشت پوست چڑھا دیا جاتا ہے تو ایسے ہی زبانوں کا ایک ڈھانچہ اور سانچہ بھی ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے اوپر دوسری زبان کا گوشت پوست بھی چڑھ سکتا ہے۔ تو وہ سانچہ اور ڈھانچہ کیا ہے اور اس کا پتا کس طرح چلتا ہے؟ اس کا پتا بنیادی طور پر تین چیزوں سے چلتا ہے۔

کسی زبان کے افعال اور کسی زبان کی ضمیریں اور کسی زبان کے اسمائے اشارہ اور اس کے جو حروفِ ربط ہوتے ہیں، سب سے پہلے ان کا پتا چلایا جاتا ہے کہ اس کا تعلق کس سے ہے تو اردو زبان کے جو افعال ہیں، آنا، جانا، سونا، کھانا، پینا، بیٹھنا، یہ نہ عربی ہیں نہ فارسی۔ دوسری بات جو اس کے اسمائے اشارہ ہیں یہ، وہ اور اسی طرح ضمیریں ہیں، میں، تم، ہم، یہ سب کے سب کسی غیر زبان کے نہیں ہیں۔ نہ عربی کے ہیں، نہ فارسی کے، نہ کسی اور غیر ملکی زبان کے ہیں۔ تو اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اردو زبان بنیادی طور پر ہندوستانی ہے، کیونکہ اس کے افعال ہندستانی، اس کی ضمیریں ہندستانی، اس کے اسمائے اشارہ ہندستانی۔ یہ پہلی بات ہوگئی کہ یہ ہندستانی زبان ہے۔

اب دوسری ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں جہاں تک اس کے امتیاز کا سوال ہے تو آپ سب ادب کے طالب علم ہیں اور تاریخ ادب کے بھی طالب علم ہیں۔ اردو زبان کے آغاز کے نظریات کے سلسلے میں آپ سب کو پڑھایا گیا ہے کہ دہلی اور اس کے اطراف میں (امیر خسرو نے دہلی و پیرامنش کا لفظ استعمال کیا ہے) جو زبان قدیم زمانے سے بولی جاتی تھی مثلاً سنسکرت، سنسکرت سے پھر پالی، پالی کے بعد اپ بھرنشیں۔ ان سے نکلی ہوئی جو زبان تھی، جسے اب کھڑی بولی کہتے ہیں، مسلمانوں کے فتح دہلی کے بعد اطراف دہلی میں جب عربی و فارسی کے الفاظ، ترکی کے الفاظ کا داخلہ کھڑی بولی میں ہوا تو اس سے اردو زبان ممتاز ہوئی یا قائم ہوئی یا اس کی قدیم شکل بن گئی۔ تو دہلی اور اس کے اطراف کی زبان پر مسلمانوں کی آمد کے بعد جو تغیرات ہوئے اور تبدیلیاں ہوئیں، ان کے ذریعے سے جو زبان وجود میں آئی، بنیادی طور پر وہی ہماری اردو زبان ہے۔ پھر اس کے بعد اس میں عہد بہ عہد

تغیرات ہوتے رہے۔ دوسری زبانوں کے درمیان سے اس کے امتیاز کا جو سلسلہ قائم ہوا، وہ گویا عربی و فارسی عناصر کے داخلے کے ذریعے سے ہوا۔ پھر اس کا عہد بہ عہد ارتقا ہوتا رہا۔

جو ہمارا دکنی دور ہے ولی تک، وہ پورے تین سو سال کا ہے۔ اس تین سو سال کے عرصے میں اردو زبان نے مقامی عناصر کی طرف توجہ زیادہ دی، اور اس سے اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی اور زبان کے ارتقا کی مختلف شکلیں وجود میں آتی رہیں۔ زبان ترقی کرتی رہی۔ اس میں ملا وجہی بھی پیدا ہوئے انھوں نے "سب رس" لکھی۔ نصرتی پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے قصائد لکھے۔ اس کے علاوہ مثنویاں لکھیں وغیرہ وغیرہ۔ قلی قطب شاہ سے لے کر بلکہ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" سے لے کر یہ پورا ادب تین سو سال کا ہے۔ اگر آپ قلی قطب شاہی دور کے ادب کا مطالعہ کریں، عادل شاہی دور کے ادب کا مطالعہ کریں، بہمنی دور کے ادب کا مطالعہ کریں تو ہمارے اردو ادب کی پوری تاریخ چھ سو سال کی ہے۔ اس چھ سو سال میں ولی تک دکنی دور کا جو زمانہ ہے، وہ تین سو سال کا ہے اور اس کے بعد شمالی ہند کا جو دورِ اول ہے جس کو دورِ ایہام گویاں کہتے ہیں، آبرو اور ناجی سے لے کر موجودہ ۲۰۱۷ تک یہ پورا عرصہ بھی تین سو سال کا ہے۔ تو دکنی دور پورے تین سو سال پر محیط ہے جب کہ بقیہ شمالی ہند کا موجودہ دور تین سو سال پر محیط ہے۔

اپنی تاریخ کے ابتدائی تین سو سال تک اردو زبان نے، اپنے ارتقا میں زیادہ سے زیادہ جو مقامی عناصر تھے، ہندستانی عناصر تھے، اُن کے اوپر تکیہ کیا اور ان کے ذریعے اپنے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ مثال کے طور پر نصرتی کے ایک قصیدے کے دو چار شعر ہم آپ کو سناتے ہیں۔ اس نے علی عادل شاہ ثانی کی تعریف میں، اس کی ایک جنگ میں فتح یابی کے موقعے پر ایک قصیدہ کہا۔ وہ اس میں کہتا ہے:

اے شہ تو ہم نامِ علی، شاہاں پو تیری سروری
دُلدُل فلک کا راج تج، کرتا زمانہ قیصری

تو اپنے طور پر اس کے اندر بھی شکوہِ بیان پایا جاتا ہے۔ اور اسی میں ایک شعر اور سنیے۔ وہ کہتا ہے:

جاں تو کٹک لے، ٹک اٹک، سنمکھ ہلک سوندل کیا
کھڑکاں کوں کھڑکاں لگ ادک، ہر اک کھڑک ہوئی کھر کھری

'جاں' کے معنی ہیں جہاں، 'تو کٹک لے' کے معنی ہیں، تم فوج لے کر، 'ٹک اٹک' یعنی تھوڑا سا ٹھہر کر، 'سنمکھ ہلک' یعنی آمنا سامنا کرتے ہوئے، للکارتے ہوئے۔ 'سوندل کیا' یعنی جنگ کی۔ پورے مصرعے کا مفہوم یہ ہے کہ اے ممدوح! جہاں کہیں بھی تم نے اپنی فوج لیکر اور تھوڑا سا جم کر اپنی فوج مقابل سے سوندل کیا یعنی اس سے مقابلہ کیا۔ 'کھڑکاں کوں کھڑکاں لگ ادک' تو تلواریں تلواروں سے خوب ٹکرائیں۔ 'ہر اک کھڑک ہوئی کھر کھری' یعنی جتنی تلواریں تھیں، کند ہو گئیں۔ جگہ جگہ سے ان میں دندانے پڑ گیے۔ ایسی زبردست تم نے جنگ کی۔ تو اس شعر کو سنانے کا مقصد یہ ہے کہ دیکھیے وہ مقامی الفاظ سے اپنے پورے مضمون کو ادا کرتا ہے۔ اپنے ممدوح کی

شجاعت ، اس کی بہادری ، بلکہ اس قصیدے کے سارے مضامین اور اس میں جتنے اس کے لیے استعارے استعمال کیے جتنی تشبیہیں استعمال کیں، جتنے مفردات استعمال کیے، مرکبات استعمال کیے، وہ زیادہ تر مقامی ہیں۔ چنانچہ اسی قصیدے میں آگے کہتا ہے:

داراستے کجر واٹل تج داب تل دابے گیے

وہ کہتا ہے دارا جیسے کجرو، ٹیڑھی چال چلنے والے، اٹل نہ ٹلنے والے، تمھارے دباؤ کے نیچے دب گیے۔

او چار کر جب جگ میں توں ظاہر کیا اسکندری

یعنی جب تم نے دنیا میں اپنی قوت ظاہر کر کے اسکندری دکھائی ، یعنی اپنی بہادری دکھائی ، اپنی بادشاہت دکھلائی تو دارا جیسے کجر واٹل تمھارے داب کے تلے داب دیئے گیے ۔اسی قصیدے میں وہ یہ بھی کہتا ہے:

تجھ شہ جواں کے سامنے رستم تو یک نخواہ ہے
رکھتا ہے تس گرزِ گراں تو جھنجھنے تے کمتری

ان مثالوں کے ذریعے یہ بتانا مقصود ہے کہ دکنی دور میں ہماری جو اردو زبان ہے، اس نے مقامی عناصر سے پورا پورا کسب فیض کیا اور جتنی اس کے اندر گنجائش تھی، اس گنجائش سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ زبان کے ارتقا میں بھی اور اس کے قیام میں بھی۔ پھر مختلف اصناف کے اندر چاہے وہ مثنوی ہو، چاہے وہ قصیدہ ہو، چاہے وہ غزل ہو، ہر صنف کے اندر اس زبان نے ارتقا کی مختلف منزلیں طے کیں اور ہندی الاصل عناصر سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔

پھر اس کے بعد ولی سے اس زبان کا اگلا دور شروع ہوتا ہے۔ ولی کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو فارسی عناصر کے ساتھ مربوط کر دیا۔ ابھی جو آپ نے کلام سنا، اسی طرح سے اگر آپ قلی قطب شاہ کی غزل پڑھیں تو وہ غزل بھی مقامی عناصر پر مشتمل ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

سکھی آج پیالہ انند کا پلا مجھ
و یاقوت ادھراں کی مستی دلا مجھ

اس شعر میں وہ محبوب کے یاقوت ادھراں کا ذکر کرتا ہے۔ ادھر کے معنی ہوتے ہیں ہونٹ، تو وہ کہتا ہے کہ تم مجھ کو یاقوت جیسے لبوں کی مستی دلا دو۔ اور سکھی آج مجھے آنند کا پیالہ پلا دو، خوشیوں کا جام پلا دو۔ پھر بعد میں جب ولی نے اس زبان کو فارسی عناصر سے ہم آہنگ کر دیا تو میر نے اس طرح کہا:

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

تو سفر شروع ہوا تھا 'یاقوت ادھراں' سے اور ''یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ'' کے ذریعے اب زبان اگلے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ پورے تین سو سال تک اردو زبان نے مقامی عناصر، مقامی تلمیحات سے، مقامی استعاروں سے اور مقامی مرکبات و مفردات سے پورا پورا استفادہ کیا۔ اور جب مقامی عناصر سے پوری طرح کسب

فیض کر چکی تو اس نے اب فارسی کی طرف اپنا ارتفاع کیا۔ چنانچہ فارسی عناصر کو، فارسی تلمیحات کو، فارسی استعاروں کو، فارسی تشبیہات کو اردو میں داخل کیا گیا۔ یہ لسانی اور تاریخی کارنامہ ولی نے انجام دیا۔ دکنی شعرا میں آپ ولی کا کلام پڑھیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زبان کا اب انداز تبدیل ہوگیا ہے:

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا
دمِ عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

اب 'یاقوت ادھران' جیسی ترکیبیں نہیں آرہی ہیں بلکہ ''روح بخشی ہے کام تجھ لب کا'' اور ''دمِ عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا'' میں فارسی ترکیبیں لائی جارہی ہیں۔

رگِ یاقوت کے قلم سے لکھیں
خط پرستاں پیام تجھ لب کا

یعنی رگِ یاقوت کے قلم سے خط پرست تمھارے لبوں کا پیام لکھ رہے ہیں۔ یاقوت ایک قیمتی پتھر ہے اور اس کی باریک نسیں رگِ یاقوت کہلاتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نزاکت اور لطافت کی وجہ سے تمھارے لب کا پیام لکھنے کے لیے رگِ یاقوت کا قلم استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

رگِ یاقوت کے قلم سے لکھیں
خط پرستاں پیام تجھ لب کا

اس شعر میں لفظ یاقوت میں ایک خاص رعایت یہ ہے کہ بغداد میں جو عباسی خلیفہ تھا معتصم باللہ، اس کے زمانے کا ایک بہت مشہور خطاط تھا جو یاقوت مستعصمی کہلاتا ہے تو یہاں اس کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہاں 'خط پرستاں'، 'پیام تجھ لب کا' اور 'لب' کے ساتھ 'خط پرستوں' کے ذکر کی مناسبت کیا ہے؟ اس کی مناسبت یہ ہے کہ 'خط' ہونٹ کے اوپر جمنے والے باریک روئیں کو بھی کہتے ہیں، تو تمھارے ہونٹوں کے اوپر اے میرے محبوب! جو باریک باریک روئیں جمے ہوئے ہیں وہ اتنے خوب صورت ہیں کہ اس کو بھی خط سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور اس کے چاہنے والے یعنی عشاق گویا خط پرست ہیں۔ اسی لیے عاشقوں کو تمھارے لبوں کا پیام لکھنے کے لیے رگِ یاقوت کے قلم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ رگ کا ذکر بعد میں غالب نے بھی کیا ہے:

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

رگ باریک نسوں کو کہتے ہیں تو گویا محبوب کے ہونٹوں کے ذکر کی مناسبت سے، اس کی لطافت کی مناسبت سے، اس کی نزاکت کی مناسبت سے، شاعر یہ کہتا ہے کہ خط پرست لوگ تمھارے لبوں کے پیام کو رگِ یاقوت کے قلم سے لکھتے ہیں۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

حکمت و منطق و معانی پر
مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

اب لب سے چونکہ منطق کا بھی تعلق ہے، کیوں کہ وہ آلۂ نطق ہے اور حکمت کا بھی تعلق ہے کیوں کہ حکیمانہ اور

فلسفیانہ باتوں کا بیان لبوں سے ہوتا ہے، اور معانی علمِ بلاغت کو کہتے ہیں جس کے تحت معنی، بیان، بدیع تینوں شامل ہیں، اور مطلق بلاغت کو بھی علمِ معانی کہا جاتا ہے۔ اس لیے محبوب کے لبوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارے لب کا کلام حکمت و منطق اور معانی و بیان گویا سب پر مشتمل ہے۔ تو اس مثال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کہاں نصرتی کا آپ نے کلام سنا اور کہاں اس کے بعد ولی کے دور تک پہنچتے پہنچتے اس زبان نے اپنا رشتہ فارسی سے استوار کرلیا۔

ہندستان کی وہ تمام زبانیں جن کو ہم نے جدید ہند آریائی زبانیں کہا ہے، ان کے مقابلے میں اردو کا امتیاز یہ ہے کہ دوسری زبانیں اپنے دائرے میں ہی محدود رہ گئیں، وہ تین سو سال بعد بھی اس دائرے سے باہر نہیں نکلیں۔ اور اردو نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اپنی جڑوں سے پورے تین سو سال تک زیادہ سے زیادہ کسبِ فیض کرنے کے بعد اس نے اپنا رشتہ فارسی سے جوڑ لیا۔ جس طرح مختلف پودوں کی قلم ہوتی ہے اور ایک پودے کو دوسرے پودے سے جوڑتے ہیں، جس سے اس میں نیا ذائقہ، نئی لطافت، نیا مزا پیدا ہوجاتا ہے تو ایسے ہی اردو زبان کا امتیاز یہیں سے قائم ہوگیا۔ اگر اردو اپنے اسی دائرے میں محدود رہ جاتی جیسے دوسری زبانیں، مراٹھی ہے، تیلگو ہے، پنجابی ہے، بنگالی ہے وغیرہ وغیرہ تو اس کی ساری لطافت مقامی عناصر تک ہی محدود رہ جاتی، لیکن اس نے یہ نہیں کیا۔ یہ غیر معمولی کارنامہ تاریخی طور پر اردو زبان نے یا یوں کہیے کہ اردو زبان کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں نے، اس کے شعرا نے، اس کے ادبا نے، اس کے اہلِ قلم نے اور اس کے بولنے والوں نے انجام دیا کہ فارسی کے ساتھ اردو کو پیوست کردیا۔ فارسی کے ساتھ اردو کی قلم لگادی۔ اور جب فارسی سے اس کا رشتہ قائم ہوگیا تو چھ سو سال کی فارسی قصیدے کی تاریخ، ایسے ہی فارسی غزل کی تاریخ، فارسی مثنویات کی تاریخ اور اس کے علاوہ جو دوسری اصناف ہیں، ان کی تاریخ اردو شاعری سے پیوست ہوگئی۔ اور اردو شاعری سے پیوست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اردو میں فارسی طرز کی غزلیں اور مثنویاں کہی جانے لگیں۔ اسی طرح اردو میں فارسی طرز کے قصائد کہے جانے لگے۔ ابھی آپ نے نصرتی کے قصیدے کا شعر سنا:

اے شہ تو ہم نامِ علی، شاہاں پو تیری سروری
دُلدُل فلک کا راج تج، کرتا زمانہ قیصری

اور اب سودا کا انداز دیکھیے۔ سودا کیا کہتے ہیں:

برجِ حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاج دار
کھینچے ہے پھر خزاں پہ صفِ لشکرِ بہار
کہتے ہیں، یوں زبانیِ پیکِ صبا یہ حکم
پہنچا حضور سے طرفِ باغِ روزگار
مرکب جو شاخسار کے ہیں اُن پہ اب شتاب
پہنچیں سوار ہوکے جوانانِ برگ و بار
ہیں بخشی و وزیر جو مرّیخ و ماہتاب
اُن کو یہ امر ہے کہ امیرانِ نامدار!

منہ کھول دو خزائنِ گل اشرفی کا تم
پکڑو قلم کو ، ہاتھ رکھو پیادہ و سوار

جیسے ہی فارسی زبان سے یہ زبان پیوست ہوئی، اس کا لہجہ تبدیل ہوگیا۔ اس کا انداز بدل گیا۔ تو نصرتی کے کلام میں کوئی کمی نہیں ہے۔ باقر آگاہ نے اپنی ایک مثنوی کے دیباچے میں لکھا ہے اور وہ سودا کے معاصر تھے کہ بڑا افسوس ہے کہ ہمارے زمانے میں سودا کو بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے اور نصرتی کو اس کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ نصرتی کے یہاں بھی شکوہِ بیان، زورِ بیان اور تخیل کی پیچیدگی موجود ہے لیکن افسوس کہ بس اس کی زبان ذرا سی پرانی ہے، دکنی ہے، اس لیے سودا کو اس پر فوقیت دی جاتی ہے۔ وہ خیال ان کا درست تھا لیکن ان کے سامنے یہ بات پوری طرح سے منکشف نہیں تھی کہ فارسی سے پیوست ہوجانے کی وجہ سے اور فارسی عناصر کو اپنے اندر داخل کر لینے کی وجہ سے سودا کی زبان میں جو لطافت پیدا ہوگئی اور اس میں جو رعایتیں پیدا ہوگئی ہیں، وہ نصرتی کی زبان میں نہیں ہوسکتی تھیں۔ اور یہ فطری بات ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ اردو زبان کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے دائرے کو، مقامیت تک محدود رکھنے کے بجائے فارسی سے ہم آمیز کر دیا اور فارسی سے ہم آمیز کر لینے کی وجہ سے اس کو بہت وسیع میدان نصیب ہوگیا۔ اسی لیے پھر بعد میں غالب کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

گویا غالب کے دور تک آتے آتے یہ فارسی عناصر اس میں ایسے داخل ہوتے گیے، ہوتے گیے، ہوتے گیے کہ اب یہ نوبت آگئی کہ غالب یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ زبانِ ریختہ فارسی کے مقابل کیسے ہوسکتی ہے تو لاؤ میرا کلام اس کو سنادو۔ گویا تم یہ محسوس کروگے کہ اردو ادب فارسی کے ہم پلہ ہوگئی ہے۔ اپنے قصیدوں میں بھی، اپنی مثنویوں میں بھی اور اپنی غزلیات میں بھی۔ حاصلِ کلام یہ کہ زبان کی شستگی و نفاست کا جو معیار اور سلیقہ فارسی زبان کو اس کی مخصوص آب و ہوا کی وجہ سے، تمدن کی وجہ سے، تاریخ کی وجہ سے حاصل تھا اور زبان میں جو لطافت تھی، اس کو اردو نے جذب کر لیا۔

خود فارسی کا حال کیا تھا؟ علامہ شبلی نے ''شعر العجم'' میں فارسی زبان کی تاریخ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران اسلامی قلمرو میں داخل ہوگیا اور خلافتِ اسلامیہ کا حصہ بن گیا تو فارسی کی جو قدیم شکلیں تھیں، جس کو دری کہتے ہیں یا جس کو پہلوی کہتے ہیں، وہ پرانی زبان اور اس کا وہ پرانا ادب سب ختم ہوگیا اور عربی زبان و ادب کا اس پر غلبہ ہوتا چلا گیا۔ اور پھر فارسی زبان و ادب کی جو تاریخ ہے، اس تاریخ کے مطابق فارسی شعرا نے عربی سے اسی طرح کسبِ فیض کیا جیسے کہ اردو نے فارسی سے کسبِ فیض کیا۔ چنانچہ رودکی کے معاصر شعرا میں متنبی

اور ابوفراس ہمدانی کے نام آتے ہیں، اور اس کے متقدمین میں ابوتمام، جریر، فرزدق اور اخطل وغیرہ آتے ہیں۔ دوسری طرف عنصری، دقیقی اور منوچہری یہ لوگ فارسی کے مشہور شعرا ہیں۔ انھوں نے عربی شاعری کو سامنے رکھ کر غزلیات لکھیں، قصائد لکھے اور دوسری اصناف میں طبع آزمائی کی تو جدید فارسی جس کو اب ہم صرف فارسی کہتے ہیں، اس نے عربی سے پورا پورا کسب فیض کیا۔ اس طرح بالواسطہ اردو زبان نے دو زبانوں سے فیض اٹھالیا۔ ایک تو فارسی سے براہ راست اور فارسی نے جو عربی کے عناصر اپنے اندر داخل کر لیے تھے، ان عربی عناصر کو بھی اردو نے بواسطۂ فارسی اپنے اندر جذب کر لیا تو اب دوہرا فائدہ اردو زبان کو حاصل ہو گیا۔

اردو زبان کے اندر فارسی کے واسطے سے جو عناصر آئے ہیں، وہ مفردات ہوں یا مرکبات۔ تشبیہات ہوں یا استعارات یا تلمیحات ہوں۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق خود فارسی زبان وادب سے ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جو عربی سے فارسی کی طرف منتقل ہوئے ہیں تو فارسی سے پیوند کرنے کی وجہ سے اردو زبان کو دوہرا فائدہ حاصل ہوا۔ ایک تو بہت بڑا ذخیرۂ الفاظ اس کو مل گیا۔ اس ذخیرۂ الفاظ کا کچھ حصہ وہ ہے جو خود فارسی نے عربی سے حاصل کیا تھا۔ اور کچھ وہ ہے جو اس کا اپنا ہے۔ اردو زبان کو یہ جو غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا، یہ ہندستان کی دوسری زبانوں کو حاصل نہیں ہو سکا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندستان کی دوسری زبانیں مثلاً بنگالی، پنجابی یا مثلاً مراٹھی، ان زبانوں میں عربی و فارسی کے الفاظ نہیں ہیں۔ ان میں بھی ہیں۔ ان کے جو ماہرین ہیں، ان کے جو جاننے والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان زبانوں میں بھی فارسی اور عربی کے الفاظ موجود ہیں، لیکن دو فرق کے ساتھ۔ ایک فرق تو یہ کہ اردو نے اپنا رسم خط عربی رسم خط کے متوازی رکھا اور عربی کے حروف تہجی کو بھی لے لیا۔ پھر اس پر فارسی کے حروف تہجی کا اضافہ کر لیا۔ پھر اس کے بعد ہمارے یہاں جو مقامی آوازیں تھیں جو فارسی اور عربی میں نہیں تھیں، ان کے لیے الگ مخلوط حروف تہجی بنا لیے۔ مثلاً بھ، پھ، تھ، ڈھ وغیرہ۔ حاصل یہ ہے کہ اردو نے کئی طرف سے فائدہ اٹھایا۔ سب سے پہلے جو ہندستانی آوازیں تھیں ان کو لے لیا۔ پھر چ کی آواز عربی میں نہیں ہے، فارسی میں ہے۔ پ کی آواز بھی فارسی میں ہے، عربی میں نہیں ہے، اس کو بھی لے لیا۔ پھر عربی کے جو حروف تہجی تھے، وہ بھی لے لیے۔ تو عربی و فارسی کے حروف تہجی لے لینے کی وجہ سے عربی کے الفاظ یا فارسی کے الفاظ جو اردو زبان میں آئے، وہ اپنی شناخت رکھتے ہیں، پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً ضعف جب ہم 'ض' سے لکھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مادہ ض، ع، ف ہے۔ ضعف، مضاعف، اضعاف، یہ سب کے سب اسی مادہ کے الفاظ ہیں جو ہمارے یہاں استعمال ہوتے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ جو دوسری ہندوستانی زبانیں ہیں مثلاً مراٹھی یا پنجابی یا بنگالی، انھوں نے بھی عربی و فارسی کے

الفاظ لیے، لیکن ان کو بگاڑ دیا اور رسمِ خط بھی باقی نہیں رکھا۔ اس لیے پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ الفاظ عربی کے ہیں یا فارسی کے ہیں۔ تغیر و تبدیلی اردو میں بھی ہوئی لیکن اس تغیر و تبدیلی کے باوجود وہ فارسی کے عناصر، فارسی کے الفاظ یا عربی کے الفاظ اپنی پوری شناخت رکھتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ بنگالی میں بولتے ہیں مجمدار، مجمدار کیا چیز تھی؟ یہ دراصل مجموعہ دار تھا، جیسے زمین دار ہے، جاگیر دار ہے۔ ایسے ہی بنگال کے علاقے میں مجموعہ دار ہوتا تھا۔ ایک خاص رقبے کا مالک، خطے کا مالک، ریاست کا مالک، اب وہ تبدیل ہوتے ہوتے ہمارے زمانے میں مجمدار کہا جانے لگا۔ اب مجمدار سے ذہن منتقل نہیں ہوتا ہے کہ یہ ہے کیا؟ لیکن اردو میں عربی و فارسی کے بیشتر الفاظ اصل حروفِ تہجی کے باقی رکھنے کی وجہ سے اور املا کے باقی رکھنے کی وجہ سے شناخت میں آجاتے ہیں۔

ایسے ہی آپ سہسرام کا نام سنتے ہیں جہاں شیر شاہ سوری مدفون ہے۔ وہاں اس نے اُس زمانے میں ایک بہت بڑا مسافر خانہ عام مسافروں کے لیے بنایا تھا اور اس کا نام تھا ''شاہ سرائے عام''۔ پھر شاہ سرائے عام سے وہ بدل کر ''شہسرام'' ہو گیا، پھر سہسرام ہوا۔ اب موجودہ زمانے میں 'ساسارام' کہا جاتا ہے۔ تو ساسارام، سہسرام، شہسرام، شاہ سرائے عام یہ اس لفظ کی مختلف منزلیں ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اردو نے جو عناصر زیادہ تر فارسی سے یا عربی سے فارسی کے واسطے سے لیے ہیں تو ان میں بھی بیشتر کا چونکہ املا محفوظ ہے، اس لیے ہم کو پتا چل جاتا ہے کہ یہ الفاظ کہاں سے آئے ہیں؟ ان کی اساس کیا ہے؟ ان کا تعلق کس سے ہے؟ یہ بھی اردو زبان کا ایسا امتیاز ہے جو ہندستان کی دوسری زبانوں کو نصیب نہیں ہے۔

واضح رہے کہ جب ایک زبان میں کوئی لفظ کسی دوسری زبان سے آتا ہے تو اپنے ساتھ بعض نئے تصورات و احساسات بھی لاتا ہے تو اردو کو فارسی کی تلمیحات، استعارات، تشبیہات اور اصطلاحات وغیرہ کے ذریعے سے بہت سے ایسے تصورات و احساسات بھی حاصل ہو گیے جو ہندستان کی دوسری زبانوں کو نصیب نہیں۔ مثال کے طور پر ذوقؔ بہار کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

سوال یہ ہے کہ صغریٰ کیا چیز ہے؟ کبریٰ کیا چیز ہے؟ نتیجہ کیا چیز ہے؟ یہ منطق کی اصطلاحیں ہیں۔ علم منطق کے اندر کسی نتیجے کو نکالنے کے لیے سولہ شکلیں ہیں۔ ان سولہ شکلوں میں سے ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک صغریٰ ہو، ایک کبریٰ ہو، ان دونوں سے نتیجہ نکالا جائے جیسے دنیا متحرک ہے اور ہر متحرک فانی ہے، لہٰذا دنیا فانی ہے۔ تو اس کا جو پہلا مقدمہ ہے 'دنیا متحرک ہے' یہ ہے صغریٰ، پھر اس کے بعد جو دوسرا مقدمہ ہے کہ 'ہر متحرک فانی ہے'، اس کو کہتے ہیں کبریٰ۔ اور پھر اس سے جو نتیجہ نکالا گیا 'لہٰذا دنیا فانی ہے' یہ ہے نتیجہ۔ تو اب یہ جو تینوں

اصطلاحیں انھوں نے استعمال کیں صغریٰ، کبریٰ اور نتیجہ تو ظاہر ہے کہ یہ اردو کی اصطلاحیں نہیں تھیں۔ یہ اصطلاحیں تو عربی میں وجود میں آئیں۔ عربی میں علمِ منطق کی کتابوں کے اندر صغریٰ، کبریٰ اور نتیجے کے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ پھر جو فارسی کی کتابیں ہیں، ان کے اندر بھی علمِ منطق کی یہ ساری کی ساری اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اردو نے ان کو لے لیا تو یہ سارے تصورات اردو میں منتقل ہو گیے تو حاصل یہ کہ اردو میں عربی و فارسی لفظوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہی نہیں آیا بلکہ ہر لفظ اپنے ساتھ احساسات، تعبیرات اور اس کے بہت سارے متعلقات لے کر داخل ہوا۔

اس پوری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان ہندستان کی دوسری آریائی زبانوں کے مقابلے میں اس لیے باثروت اور باقوت ہے کہ اس کے پاس تین طرح کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے۔ اول مقامی الفاظ، دوسرے فارسی کے الفاظ اور تیسری طرف عربی کے الفاظ۔ بیک وقت اس کے پاس تین تین زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ ہیں۔ لہذا وہ جب چاہے، عربی کا لفظ استعمال کرلے، جب چاہے فارسی کا استعمال کرلے، اور جب چاہے اردو کا لفظ استعمال کرلے۔ تو وہ تمام زبانیں جن کے پاس ایک ہی طرح کا ذخیرہ ہے، ان کے مقابلے میں یقیناً اس زبان کی طاقت زیادہ ہوگی جس کے پاس تین تین طرح کے ذخیرۂ الفاظ موجود ہیں۔

یہ تو الفاظ کے حوالے سے بات تھی۔ الفاظ کے بعد ایک چیز ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں قواعد یا لسانی نقطۂ نظر۔ تو لسانی نقطۂ نظر سے بھی اردو نے ان دونوں زبانوں یعنی عربی و فارسی سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اس سلسلے کی تمام چیزوں کو اس تھوڑے سے وقت میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہم یہاں آپ سے صرف چند باتیں بتائیں گے مثلاً واحد اور جمع کے بارے میں۔ اردو میں 'کتاب' کی جمع 'کتابیں' ہوتی ہے، اور 'صراحی' کی جمع 'صراحیاں' تو گویا ''ی'' اور ''ن'' کے ذریعے جمع بنا لیتے ہیں، اور کبھی ''ی''، ''و'' اور ''ن'' کے ذریعے بھی جمع بنا لیتے ہیں مثلاً آدمیوں نے یہ کہا۔ لوگوں نے یہ کہا وغیرہ وغیرہ۔ گویا جمع بنانے کا صرف یہی دو مقامی طریقہ اس کے پاس موجود تھا۔ بہت پہلے قدیم اردو میں دیکھیں تو 'ان' سے بھی جمع بنتی ہے۔ لوگاں، عورتاں، مرداں تو جمع کا یہ بھی ایک طریقہ ہو گیا۔ اب تین طریقے ہو گیے واحد سے جمع بنانے کے۔ ''ا۔ن''، ''ی۔ن''، ''و۔ن''، ان تینوں طریقوں سے اردو میں جمع بنتی تھی۔ پھر جب فارسی سے اس نے اپنا رابطہ کرلیا تو فارسی میں 'ہا' لگا کے جمع بنتی ہے اور 'ا۔ن' سے بھی جمع بنتی ہے۔ اسپ کی جمع اسپاں، اسپ بہ معنی گھوڑا اور اسپاں بہ معنی گھوڑے تو ''ا۔ن'' سے بھی جمع بنتی ہے اور ''ہ۔الف'' سے بھی جمع بنتی ہے مثلاً کتاب سے کتابہا اور باغ سے باغہا وغیرہ۔ اور اب اردو کے پاس اپنا مال تو تھا ہی، 'ا۔ن'، 'و۔ن'، 'ی۔ن' اس نے فارسی سے بھی جمع لینا شروع کر دیا۔ مثلاً:

بہ شغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تشبیہِ کوکب ہا

یہ غالبؔ کے ابتدائی دور کا غیر متداول کلام کا شعر ہے لیکن اس میں فارسی جمع کا استعمال تو کیا گیا ہے۔ مصرعِ اول میں 'شب' کی جمع ہے 'شبہا' اور مصرعِ ثانی ''سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تشبیہِ کوکب ہا'' میں کوکب کی جمع ہے 'کوکب ہا'۔ اس کے علاوہ اس شعر میں 'مہوش' کی جمع 'مہوشاں' بھی آئی ہے۔ اس فارسی طریقے سے بھی جمع بنانے کا اردو میں عام رواج ہے۔ اسی طرح خواجہ آتشؔ کا شعر ہے:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اس میں ہزار کی جمع فارسی طرز پر 'ہزارہا' لائی گئی ہے۔

اس سے بھی اور آگے بڑھیے تو اردو کو ایک اور فائدہ حاصل ہے۔ عربی میں جمع کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جس کو جمع سالم کہتے ہیں اور ایک قسم وہ ہوتی ہے جس کو جمع مکسر کہتے ہیں۔ جمع سالم وہ ہے جس میں واحد کا وزن جمع میں سلامت رہے یعنی باقی رہے جیسے مسلم کی جمع مسلمون، م، س، ل، ان سب پر جو حرکت ہے یعنی میم پر پیش اور ل پر زیر، یہ جمع میں بھی برقرار ہے۔ اسی طرح مسلمۃ سے مسلمات میں بھی واحد کا وزن برقرار ہے۔ اس کو جمع سالم کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جمع میں جب واحد کے لفظ کا وزن ٹوٹ جائے تو اس کو جمع مکسر کہتے ہیں، جیسے کتاب کی جمع کُتُب۔ 'کتاب' جب واحد آپ نے کہا تو 'ک' پر زیر تھا اور جب 'کتب' کہا تو 'ک' کے اوپر پیش آ گیا۔ ایسی جمعوں کو جمع مکسر کہتے ہیں۔ اردو کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فارسی کی جمعیں تو لے ہی لیں، اس کے علاوہ عربی سے جمع مکسّر بھی اور جمع سالم بھی حاصل کر لیں۔ اس طرح اس کے پاس اب جمعوں کا ذخیرہ بہت زیادہ ہو گیا۔ آپ علامہ اقبالؔ کا یہ شعر سنیے:

اے انفُس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ زندہ و پائندہ ہے تری ذات

نفس کی جمع انفُس، اُفق کی جمع آفاق اور آیت کی جمع آیات۔ ایک ہی مصرعے میں تین تین عربی جمعیں ہیں۔ پہلی دونوں جمع مکسر ہیں اور تیسری جمع سالم ہے۔ دوسری زبانوں کو تو جمع کا یہ طریقہ نصیب ہی نہیں لیکن اردو کو یہ سہولت ہے کہ فارسی طریقے سے بھی جمع بنا لے اور جب چاہے عربی طریقے کے مطابق جمع بنا لے۔ علامہ اقبالؔ نے نعت کا موضوع اختیار کرتے ہوئے شعر کہا ہے:

وہ دانائے سُبُل، ختم الرُسُل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

رُسُل، رسول کی جمع ہے اور سُبُل، سبیل کی جمع ہے۔ وہ دانائے سُبُل، ختم الرُسُل، مولائے کل جس نے/ غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا۔ تو دیکھیے کیا غیر معمولی طاقت ہے اردو کے پاس۔ جتنی فارسی کی جمعیں تھیں سب اس کی، اور جتنی عربی میں جمع مستعمل ہیں سب اس کی، اور جتنی اردو کی جمع ہیں سب

اس کی ۔تو بیک وقت اس کے پاس اتنی ثروت ، اتنی طاقت ہے۔ظاہر ہے یہ بات دوسری زبانوں کونصیب نہیں ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مثال لیجیے: ''صفت، موصوف''۔صفت، موصوف کا عام طریقہ اردو میں یہ ہوتا ہے: اچھا لڑکا، اچھی لڑکی، اچھا خط، اچھی کتاب، یہ اردو کا عام طریقہ ہے۔اور اس عام طریقے میں یہ ہوتا ہے کہ صفت پہلے لائی جاتی ہے اچھی، اچھا، سیاہ، سفید اور اس کا موصوف بعد میں لایا جاتا ہے۔سفید گھر، سفید کاغذ وغیرہ وغیرہ۔اور عربی کا جو طریقہ ہے یا فارسی کا اس میں معاملہ برعکس ہوتا ہے، برعکس یہ ہوتا ہے کہ موصوف پہلے آتا ہے اور صفت بعد میں آتی ہے۔جیسے کتابِ نو ،نئی کتاب، کتاب پہلے ہوگیا اور اس کی صفت نو ، یہ بعد میں آئی۔کتابِ جدید، کتابِ قدیم، تو اردو نے کیا کیا کہ اپنا جو صفت موصوف بنانے کا طریقہ تھا، وہ تو ہے ہی اس کے پاس۔ وہ تو اس کا اپنا مال ہے۔آگے بڑھ کر اس نے فارسی کے مرکباتِ توصیفی اور مرکباتِ اضافی بھی سب کے سب اپنے ذخیرے میں شامل کرلیے۔اب جب اس کا دل چاہے وہ فارسی انداز سے موصوف صفت بنالے، اور جب چاہے اردو کے انداز سے بنالے۔

جو واحد جمع کی بات تھی، اسی کے حوالے سے ایک بات اور ہے۔ایک چیز ہوتی ہے جسے عربی میں تثنیہ کہتے ہیں۔ تثنیہ کہتے ہیں دو کو۔اردو میں عام طور پر واحد اور جمع کا استعمال ہوتا ہے۔تثنیہ کا استعمال نہیں ہوتا۔لیکن اردو نے یہاں بھی دانائی کا ثبوت دیا اور یہ کہا کہ نہیں جب ہم چاہیں گے تثنیہ بھی استعمال کرلیں گے۔دوسری کسی جدید ہندستانی زبان کے پاس تثنیہ نہیں ہے، اردو کے پاس وہ بھی ہے۔جیسے والدین۔والد اور والدہ دونوں کو ملا کر کہنے کے لیے تثنیہ استعمال ہوتا ہے تو اردو میں والدین بھی استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح مکہ و مدینہ دونوں کو ملا کے کہا جاتا ہے حرمین شریفین ۔تو عربی کی طرح حرمین شریفین ہمارے یہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔والدین بھی استعمال ہوتا ہے۔تو جب چاہو تثنیہ بھی استعمال کرلو۔عربی کے اس مال پر بھی اردو کا تصرف ہے۔اردو کو اختیار ہے کہ اس کو بھی استعمال کرلے۔شاہ مبارک آبروؔ کا شعر ملاحظہ ہو:

اُن بھواں سے لگے ہیں جس کے نین
وہ کہا جاتا ہے حاجی الحرمین

اسی طرح میر انیسؔ کا مشہور شعر ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولیٰ نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

پھر یہ جو صفت موصوف کی بات بتائی تو عربی میں صفت و موصوف کا ایک قاعدہ ہے کہ اگر موصوف غیر ذوی العقول میں ہے۔غیر ذوی العقول سے مراد یہ کہ بے جان چیز ہے تو اس کی جو صفت لائی جاتی ہے، وہ واحد مؤنث کی شکل میں لائی جاتی ہے جیسے ارشاداتِ عالیہ، ارشادات جمع اور عالیہ واحد مؤنث۔فنونِ لطیفہ، فنون جمع اور لطیفہ واحد مؤنث۔عربی کے اس قاعدے سے بھی اردو نے فائدہ اٹھالیا۔کہا یہ بھی ہمارا مال

ہے، یہ بھی ہم استعمال کریں گے۔ چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ اصطلاح موجود ہے فنونِ لطیفہ کی، اور ایسے ہی بولتے ہیں۔ علومِ اسلامیہ بھی ہمارا، فنونِ لطیفہ بھی ہمارا۔ کبھی کبھی عربی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ موصوف جمع ہو اور اس کی صفت بھی جمع لائی جائے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب موصوف ذوی العقول میں سے ہو یعنی انسانوں کی طرح، جان دار چیزوں کی طرف اشارہ ہو۔ اردو نے کہا یہ بھی ہم آپ سے لے لیں گے۔ جیسے ازواجِ مطہرات تو ازواج موصوف اور جمع اور مطہرات اس کی صفت، اور وہ بھی جمع۔ تو اردو میں ازواجِ مطہرات بھی استعمال ہوتا ہے اور فنونِ لطیفہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ علومِ اسلامیہ بھی استعمال ہوتا ہے، علومِ جدیدہ بھی استعمال ہوتا ہے، علومِ قدیمہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ تو صفت موصوف کی جو شکلیں عربی میں رائج تھیں کہ موصوف جمع کے مقابل صفت بھی جمع، یا موصوف جمع کے مقابل صفت واحد۔ اردو نے کہا یہ بھی ہمارا مال ہے اور وہ بھی ہمارا مال ہے، کیونکہ موقع ومحل کے لحاظ سے سب اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جب چاہو خود اردو طریقے سے واحد جمع اور صفت موصوف بنالو۔

یہ تو ہم نے بس دو مثالیں دی ہیں۔ اسمِ فاعل میں، اسمِ مفعول میں، اسی طرح اسمِ ظرف میں جو قواعد کی مختلف اصطلاحیں ہیں، ہر جگہ اردو کے پاس تین طرح کا مال موجود ہے۔ اول مقامی یعنی ہندستانی۔ دوسرے فارسی کا اور تیسرے عربی کا۔ تینوں کے تینوں اس کے بس میں ہیں۔ جیسے آپ بولتے ہیں 'مشرق'، آپ بولتے ہیں 'مغرب'، یہ مشرق ومغرب اسمِ ظرف ہے۔ مشرق طلوع ہونے کی جگہ، مغرب غروب ہونے کی جگہ، منزل قیام کرنے کی جگہ، مسجد سجدہ کرنے کی جگہ، یہ سب عربی کے اسمِ ظرف تھے۔ اردو نے کہا سب ہمارا ہے۔ اردو میں مشرق استعمال ہوتا ہے، منزل بھی استعمال ہوتا ہے، مسجد بھی استعمال ہوتا ہے، اور جب چاہیں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہ سونے کی جگہ ہے۔ تو مقامی لفظوں کو کسی نے چھینا نہیں ہے۔ مقامی الفاظ تو ہمارے پاس تھے ہی۔ اس کے علاوہ عربی وفارسی کا قواعد کے لحاظ سے تمام کا تمام ذخیرہ اردو کے پاس موجود ہے۔

ان سب کے بعد جو خصوصیت اردو کی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں تعصب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب آپ عربی کے الفاظ مت استعمال کیجیے، یا ہندی الاصل الفاظ مت استعمال کیجیے۔ پوری چھوٹ ہے شاعر کو، ادیب کو، لکھنے والے کو، بولنے والے کو، سننے والے کو، آپ جہاں جو لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھیں، وہاں وہ لفظ استعمال کرلیں، مثال کے طور پر علامہ اقبال کی بہت مشہور غزل ہے:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

اسی میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

اور اسی میں وہ کہتے ہیں:

من کی دنیا، من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا، تن کی دنیا سود و سودا، مکر و فن

تو اب آپ یہ دیکھیے کہ اقبال کس طرح کے لفظ استعمال کررہے ہیں۔ اس کے اندر بہ کثرت مقامی الفاظ ہیں یعنی اس میں ہندستانی افعال بھی استعمال کررہے ہیں، اس کے علاوہ تن اور من بھی استعمال کررہے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن
پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

بہ کثرت مقامی الفاظ سے بنائی ہوئی نہایت خوب صورت مترنم غزل موجود ہے:

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور اس موتی کو چمکاتی ہے سورج کی کرن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

بیشتر الفاظ مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اس کے ترنم میں کوئی کمی نہیں۔ دوسری جانب غالب کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جو اکثر و بیشتر فعل آنے ہی نہیں دیتے۔ ابھی اقبال کی آپ نے مثال دیکھی، زیادہ تر مقامی الفاظ، مقامی مفردات، مقامی افعال انھوں نے استعمال کیے۔ اب غالب کو دیکھیے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

پورا شعر آپ پڑھ لیجیے، کوئی فعل نہیں آنے دیا۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
کوہ کن گرسنہ مزدورِ طربِ گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کہیں کوئی فعل آنے ہی نہیں دیا، مقامی کوئی لفظ کوئی حرفِ ربط 'ہے'، 'میں'، 'کو' تک نہیں آنے دیا۔

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

حاصل یہ ہے کہ اردو زبان کے اندر ایسی ثروت ہے اور اس کے پاس الفاظ و اسالیبِ بیان کا ایسا ذخیرہ ہے کہ وہ جب چاہے اور جس رخ پر اسلوبِ بیان کو ڈھالنا چاہے، ڈھال لے۔ ابھی گفتگو کے آغاز میں آپ نے اقبال کے جو اشعار سنے:

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اسی زمین میں میر کی بھی غزل موجود ہے:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
صد موسمِ گل ہم کو تہہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہِ شیشہ گری کا
ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

آپ دیکھیے اسی زمین کو اقبالؔ نے بالکل الگ انداز میں استعمال کیا۔ یعنی اس کو نظم کے اندر ڈھال کے مسلسل خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کرلیا۔ اور اسی کو میرؔ نے استعمال کیا تو عشق اور ماورائے عشق ہر طرح کا مضمون باندھ دیا۔ لے سانس بھی آہستہ! اس کا کوئی جواب نہیں ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہِ شیشہ گری کا

اسی طرح انسان کی زندگی، اس کے مال ومتاع اور اس کے فخر وغرور سب پر یہ شعر بہترین تبصرہ ہے:

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

اردو زبان کے پاس مختلف اسالیبِ بیان موجود ہیں۔ نصرتیؔ کا اسلوبِ بیان آپ نے سن لیا۔ قلی قطب شاہ کا سن لیا۔ اس کے بعد میرؔ کا، اس کے بعد اقبالؔ کا، یہ ثروت کسی زبان کو نصیب نہیں ہے۔ اور یہ جو کہا گیا کہ آپ کی زبان سب سے زیادہ پُر شوکت ہے اور پُر قوت ہے، ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے، تعبیرات کے لحاظ سے اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے تو یہ محض دعویٰ نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔ بہ قولِ غالبؔ:

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یعنی کوئی زبان داں ہو تو اس کو بلاؤ اور اس سے پوچھو کہ اردو زبان کی ثروت کا مقابلہ، اس کے قواعد کی ثروت کا مقابلہ، اس کے ذخیرۂ الفاظ کی ثروت کا مقابلہ کسی دوسری مقامی زبان سے کرلے۔ ہرگز کسی کے پاس یہ ثروت نہیں ہے۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ جب ہم اردو زبان کی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے مختلف شعرا اور ادبا کا ذکر کرتے ہیں تو شاعروں اور ادیبوں ہی کے ذریعے ہماری ثروت کا بھی پتا چلتا ہے۔ تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کوئی غالبؔ کسی دوسری زبان میں موجود ہے؟ اور غالبؔ کا تو معاملہ یہ ہے کہ ہندستان ہی کیا ہندستان کے باہر کی زبان میں بھی کسی کو غالبؔ نصیب نہیں ہے۔ اور کسی باہر والے کو اقبالؔ

بھی نصیب نہیں ہے۔ بنگالی، تمل، تیلگو، چھوڑیے فارسی میں بھی کوئی اقبالؔ نہیں ہے اور عربی میں بھی نہیں ہے۔ عربی کا ایک شاعر ہے شوقیؔ، جس کا اقبالؔ سے موازنہ کیا کرتے ہیں۔ یہ جدید دور کا مصر کا شاعر ہے لیکن اگر آپ شوقیؔ کے کلام کو براہِ راست عربی میں پڑھیں تو آپ کہیں گے کہ علامہ اقبالؔ کا جواب شوقیؔ کے پاس بھی نہیں ہے۔ اور حافظؔ بھی مصر کے جدید شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کے معاصرین میں ہیں یا ان سے کچھ چھوٹے، وہ بھی اقبالؔ کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ اور ہندستان کی زبانوں کو چھوڑیے خود فارسی میں بھی اقبالؔ کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ جب اقبالؔ کے کلام کو جدید دور میں باضابطہ فارسی میں ایران میں شائع کیا گیا تو وہ لوگ اقبالؔ کے بارے میں کہتے ہوئے پائے گیے کہ اقبالؔ جیسا شاعر پورے چھ سو سال یا سات سو سال کی تاریخ میں فارسی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کے یہاں جس طرح ایک منظم فکر ہے، ایک فلسفہ ہے اور امتِ مسلمہ کے لحاظ سے ان کے یہاں کچھ خیالات ہیں، کچھ افکار و تصورات ہیں، ایسی فکری دبازت اور تہہ داری کا حامل فارسی یا عربی کا کوئی شاعر اقبالؔ کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ملحوظِ خاطر رہنا چاہئے کہ محض فکر سے کوئی بات نہیں بنتی جب تک فکر کو خوب صورت پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کی طاقت نہ ہو۔ اس سلسلے میں آپ کے سامنے ایک لطیفہ عرض کرتا ہوں: ''ایک کوی سمّیلن ہو رہا تھا، میرے خسرِ محترم وہاں تشریف لے گیے، ان کو بھی شعر و شاعری کا شوق تھا تو انھوں نے کہا کہ کوی سمیلن کا نام سنا تو ہم بھی چلے گیے کہ سنیں بھائی کیا کہتے ہیں۔ لیکن صاحب ہم بہت ہی بور ہوئے اور وہاں ایک کوی سنا رہا تھا: ''اونٹ کے منہ میں جیرا، دے کے بہلو لے باٹا، اور بکری کے منھ میں کونہڑا، دے کے اٹکو لے باٹا''، وہ کوی صرف یہی کہنا چاہتا تھا کہ اس دور میں انصاف نہیں۔ چھوٹے سے جو چیز سنبھل نہیں سکتی وہ اسے دے دی گئی ہے گویا بکری کے منھ میں کونہڑا دیا گیا ہے اور اس کے برخلاف اونٹ کو زیرا دے دیا گیا ہے۔ تو کیا یہ تعبیر کسی ادبی تعبیر کا مقابلہ کرسکتی ہے؟ دیکھیے اقبالؔ کیا کہتے ہیں:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اس میں بھی شکوہ کیا گیا ہے کہ بندۂ مزدور پریشانیوں کے دور سے گزر رہا ہے لیکن یہ تعبیر دیکھیے، شاعر اللہ تعالیٰ سے خطاب کر رہا ہے، اس میں اس کی بے بسی اور عاجزی بھی شامل ہے، اور ساتھ ساتھ شکوہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

ترفع دیکھیے، خیالات کی پیش کش دیکھیے، الفاظ کی تابانی و روانی دیکھیے۔ یہ کسی دوسری زبان کو نصیب نہیں ہے۔ یہ

بنیادی چیز ہے جو اردو زبان کے پاس موجود ہے۔ تو اردو زبان کے جو امتیازات ہیں وہ یہ کہ اس کے پاس مقامی عناصر بھی ہیں، فارسی عناصر بھی ہیں، اس کے بعد عربی عناصر بھی ہیں، اور کسی کسی آدمی کے پاس گودام کے اندر مال بہت رکھا ہوا ہے لیکن اس کا استعمال کچھ نہیں ہے تو وہ مال رکھنا بے کار ہوتا ہے۔ صرف ذخیرہ نہیں ہے ہمارے یہاں۔ ہمارے شعرا میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، انیسؔ تو صفِ اول کے شعرا ہیں، صفِ دوم اور سوم کے شعرا کا بھی دوسری زبانوں میں کوئی مقابلہ نہیں، بلکہ دوسری زبانوں کو جگرؔ مرادآبادی اور نشورؔ واحدی جیسا بھی کوئی شاعر نصیب نہیں۔

ہماری زبان کی جو ثروت ہے، ہماری زبان کی جو تاریخ ہے یعنی ہماری نثر کی تاریخ، ہماری نظم کی تاریخ، ہماری مختلف اصنافِ سخن کی تاریخ دوسری زبانوں کے پاس اس کا بھی کوئی جواب موجود نہیں۔ یہی حال ہماری داستانوں کا ہے جن کی 46 جلدیں تو زیورِ طبع سے آراستہ ہوسکیں اور باقی رام پور کے محافظ خانے کے اندر طویل تقطیع کی بیسیوں جلدیں غیر مطبوعہ پڑی رہ گئیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے داستانوں پر چار جلدوں میں کتاب لکھی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی صرف ان اردو داستانوں کا مطالعہ کرلے تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ہم سب یہاں اردو کے اساتذہ یا طلبہ ہیں اور ہم میں سے شاید ہی کسی کو توفیق ہوئی ہو، دو چار کے استثنا کے ساتھ، کہ اس نے ان داستانوں کا مطالعہ کیا ہو۔ تو وہ چیز ہمارے یہاں متروکات کے درجے میں ہے، دوسری زبانیں اس کا بھی کوئی موازنہ اور مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

آپ لوگوں کے سامنے جو کچھ اب تک بیان کیا گیا یہ تو مقدمہ تھا یا تمہید تھی۔ اصل کہنا آپ طلبہ و طالبات سے یہ ہے کہ اپنی زبان کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور اس کے ادب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں اور اپنے اندر بصیرت پیدا کریں۔ اپنے ادب کا مطالعہ کریں، اپنی دانشوری کے حقوق کو ادا کریں۔ ان سب کے بعد سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وقت اردو زبان جڑ سے کٹ رہی ہے۔ موجودہ سیاسی حالات کی وجہ سے نئی نسل میں داخل نہیں ہو رہی ہے، اس کے پڑھنے والے موجود نہیں ہیں۔ بہت بڑا ذخیرہ اور بہت بڑا ادب کا سرمایہ ہے لیکن پڑھے گا کون؟ تو اس تمہید کے بعد آپ کو مخاطب کرکے یہ کہنا تھا کہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔ پہلے تو یہ ہے کہ اپنی زبان سے محبت کریں، اس کو مجبوری کے طور پر نہ پڑھیں کہ صاحب اب کہیں Admission نہیں مل رہا تھا، اردو ہی میں مل گیا تو اس طرح نہ پڑھیں، بلکہ یہ کہیں کہ صاحب یہ ایک نہایت خوب صورت، نہایت طاقتور، نہایت باثروت، نہایت اعلیٰ درجے کی زبان ہے جس سے ہمارا رشتہ قائم ہوا ہے۔ اور اس کے امتیازات کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی بقا اور اس کے فروغ کی کوشش کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ ایک آدمی کیسے کوشش کرسکتا ہے؟ ہم میں سے ہر شخص یہ کوشش کرسکتا ہے۔ اپنے جو چھوٹے ہیں اپنے گھر کے، اپنے پڑوس کے، اپنے بھائی کے، اپنے بہن کے بچے، ان کو ہم اردو کی طرف

راغب کریں، ان کو بتائیں، ان کو پڑھائیں، کیوں کہ ان کے ذہن میں یعنی نئی نسل کے ذہن میں اردو سے متعلق کچھ ہے ہی نہیں، بلکہ ان کے نزدیک اردو ایک غیر ضروری چیز ہے، بلکہ بے وقت کی راگنی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ہم اردو کے طالبِ علم ہیں، ہم اردو سے محبت کرتے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے گرد و پیش والوں کو اردو کے بارے میں بتائیں، اردو کو پھیلائیں اور اس کے فروغ کی کوشش کریں، یہ ہے اصل چیز۔

آپ نے سنا ہوگا، تبلیغی جماعت آتی ہے، لوگ ان کا بیان سنتے ہیں اور آخر میں ان کے یہاں ہوتی ہے تشکیل کہ بھائی جماعت میں جانے کے لیے نام لکھائیے۔ تو آج یہاں بھی تشکیل کرنا مقصود ہے۔ آپ پہلے تو احساسِ کمتری دور کیجیے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اپنی مادری زبان سے محبت کیجیے، اس کی قدر و قیمت کو سمجھیے اور اگلی بات یہ ہے کہ اس کے فروغ کے لیے کوشش کیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ہر خاتون ایک خاندان کے برابر ہوتی ہے''، اور وہ خاندان کے افراد کی تربیت کا کام انجام دیتی ہے۔ تو بچپن سے ہی بچوں کو اپنی زبان کی اہمیت بتائیے، سمجھائیے، اس کی طرف راغب کیجیے اور اس کے خادم بنیے۔

یاد رکھیے اردو زبان کے فروغ کے لیے مسلسل خدمت کی ضرورت ہے، ریاضت کی ضرورت ہے، مجاہدے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ایک آنجہانی استاد تھے حکیم چندر، وہ بتاتے تھے کہ پہلے عدالتوں کے اندر سارا کام اردو میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب ہندی کو عدالتوں میں داخل کیا گیا اور اجازت دے دی گئی کہ ہندی میں بھی دستاویز پیش کی جاسکتی ہیں تو کوئی پیش کرتا ہی نہیں تھا۔ بہت کم لوگ ہندی میں دستاویز لکھواتے تھے۔ نیر صاحب نے بتایا کہ تب ہندی والوں نے ہر کچہری کے باہر چوکیاں لگائیں اور یہ کہا کہ ہم آپ کی دستاویز مفت میں لکھیں گے، آپ ہم سے لکھوالیجیے۔ آپ وہاں اردو میں لکھواتے ہیں پیسے دے دے کے وکیل صاحب، منشی صاحب کو۔ آپ ہم سے لکھوالیجیے ہندی میں، ہم مفت لکھنے کے لیے تیار ہیں۔ تو انھوں نے کہا کہ خاص طور پر جو شمالی ہند کا Area اور یوپی کا علاقہ تھا، وہاں تمام کی تمام کچہریوں میں بلا استثنا ان کے رضا کار بیٹھے رہتے تھے کہ مفت میں ہندی میں دستاویز لکھوالیجیے۔ تو اب آپ اردو والوں کو بھی اسی طرح رضا کارانہ خدمات انجام دینی ہوں گی کہ صاحب ہم اردو پڑھانے کے لیے تیار ہیں، ہم اردو سکھانے کے لیے تیار ہیں، آئیے ہم سے سیکھ لیجیے، پڑھ لیجیے۔ جس وقت آپ کہیے ہم آپ کو پڑھا دیں گے، تبھی اردو کا حق ادا ہوگا۔ اسی طرح اپنے گھر، اپنے محلے، اپنے پڑوس، اپنے بھائی، اپنے بھتیجے، اپنے بھانجے، ان سب کے درمیان اردو کو پھیلانے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ زبان جڑ سے کٹ رہی ہے۔ اردو کی ساری ثروت اپنی جگہ تسلیم۔ لیکن اس کو آئندہ سانس کیسے نصیب ہوگی؟ اس کو زندگی کیسے ملے گی؟ بقا کیسے ملے گی؟ آپ لوگوں کو یہی سوچنا اور سمجھنا ہے۔ اور یہی میری گفتگو کا ماحصل ہے۔ ☆☆☆

تاج الدین اشعرؔ کا شعری مجموعہ ''واشگاف''

پروفیسر محمد عثمانی ندوی

تاج الدین اشعرؔ رام نگری کے نعتیہ مجموعے جب ہمارے سامنے آئے تھے اور اس کا کچھ حصہ ہم نے پڑھا تھا تو ہمارے دل نے گواہی دی تھی کہ معاصر شعرا میں یہ سب سے بڑا شاعر ہے یا بہت بڑے نعت گو شعرا میں سے ایک ہے۔ شعر تو وہی شعر ہے جو دل میں تیرِ نیم کش کی طرح داخل ہوجائے۔ یہ مجموعے اتنے اچھے تھے کہ ایک دن ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیے جیسے کوئی محبوب ایک بار اپنا جلوہ دکھا کر، محبت کی سوغات عطا کر کے روپوش ہوجائے اور پھر نظر نہ آئے۔

مدتیں گذر گئیں اور آسمان نے ماہ و سال کی کئی کروٹیں لیں۔ اس کے بعد تاج الدین اشعرؔ رام نگری کے کلامِ بلاغت نظام کا نیا مجموعہ مجھے پیش کیا گیا جو حمد و نعت کے علاوہ غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہے۔ نئے سرے سے ایک نیا دل کش کلام پڑھنے کو ملا۔

بہت سے لوگ شعر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ وہ موزوں اور مقفی کلام کا نام ہے۔ بہت سے جدید شاعروں نے قافیہ کی شرط بھی ختم کردی اور شاعری کے نئے نئے انداز سامنے آگیے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب شعر کے ناظم بہت ہیں اور حقیقی شعر کہنے والے بہت کم ہیں۔ شعر صرف قوافی اور اوزان کا نام نہیں ہے۔ شعر وہ ہے جو انسان کے وجدان پر اور جذبے پر اثر انداز ہو اور دل کے ساز کو چھیڑ دے۔ یہ کوئل کا نغمہ بھی ہوسکتا ہے، بلبل کا نالہ بھی ہوسکتا ہے، وہ کوئی دل نشیں صدا ہوسکتی ہے، وہ نوائے عاشقانہ ہوسکتی ہے۔ ایک اچھا شعر ہماری تنہائی کی خاموشی کو ہنگامہ خیز بنا دیتا ہے۔ ایک کمزور انسان کے کمزور دل کے لیے ولولہ انگیز ثابت ہوجاتا ہے۔ دو مصرعوں کا ایک شعر ایک پورے مضمون کے برابر ہوجاتا ہے، اور ایک غزل ایک پوری کتاب کے برابر یا اس سے زیادہ مؤثر ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ اچھی غزل ہماری روح کو سرشار کردیتی ہے۔ ہم جھوم اٹھتے ہیں۔ یہ معمولی سوغات نہیں ہے جو ایک اچھے شاعر کی جانب سے ایک باذوق قاری کو ملتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پُر کیف فضا اور روحانیت کی دلکش چاندی اور جذبات کے تلاطم کی منظر کشی کے لیے فنونِ لطیفہ کے بہت سے اقسام موجود ہیں لیکن ان اقسام میں شعر کو پہلا مقام حاصل ہے۔ آپ سمندر کے ساحل پر شام کے وقت کھڑے ہیں۔ دریا کی موجیں سورج کی سنہری کرنوں

کونگل رہی ہیں۔ ایک کشتی ہے اور ایک ماہی گیر کی لڑکی، ایک دوشیزہ آہستہ آہستہ سروں میں نغمہ الاپ رہی ہے۔ اس منظر کے ساتھ دل میں اتر جانے والا اقبالؔ کا یہ شعر پڑھیے:

سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب

شعر کی اور شاعری کی بہت سی تعریفیں ہوسکتی ہیں لیکن وہی شاعر حقیقت میں شاعر ہے جو اپنے چوبِ خامہ سے روح اور خیال کی ترجمانی کرے اور ان لوگوں کو بھی وہ منظر دکھلا دے جو منظر سے بہت دور ہیں، اور ان کے دلوں میں وہی جذبات پیدا کردے جو شاعر کے دل میں ہیں۔ تاج الدین اشعرؔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ اچھے شاعر بہت ہوسکتے ہیں۔ ان شعرا میں تاج الدین اشعرؔ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ بامقصد اور تعمیر پسند شاعر ہیں۔ شعر ان کے نزدیک محض آرائش، زیبائش اور لفظوں کی نمائش کا نام نہیں ہے۔ ایک اچھی اور بامقصد شاعری کا مقصد کیا ہے، اقبالؔ نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

شاعرِ دل نواز بھی بات کہے اگر کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

شانِ خلیل یعنی پیغمبرانہ شان اس کے کلام میں ہوتی ہے، وہ اپنی چشمِ روحانی سے معاشرے کی خرابیوں کو دیکھ لیتا ہے اور کلامِ نرم و نازک سے اصلاح کی تدبیریں کرتا ہے، وہ حیات و کائنات کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار مناسب اور موزوں اشعار کے ذریعے کرتا ہے۔ شاعر کی روح نبضِ حیات کی دھڑکنیں سُن لیتی ہے، اس کے اندر وہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ سکوتِ لالہ و گل سے کلام کرسکتا ہے۔ وہ عجیب و غریب انسان ہوتا ہے، وہ خاکی ہوتے ہوئے بھی خاک سے پیوند نہیں رکھتا ہے۔ اس کے اندر روحانی، رومانی اور ملکوتی صفات پائی جاتی ہیں۔ اس لیے شاعر ہونا بہت بڑی بات ہے۔ شاعر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ روز لازمی طور پر الفاظ کا ایک مجموعہ بنا کر پیش کرے۔ شاعر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر شعور پایا جاتا ہے، جذبہ پایا جاتا ہے اور روحانیت کی حرارت پائی جاتی ہے۔ یہ کیفیات جس شخص کے اندر جس قدر زیادہ پائی جاتی ہیں، وہ اتنا ہی بڑا شاعر ہے، اور پھر اگر اسے ان کیفیات کو لفظوں کا جامہ پہنانا آتا ہے تو اس کا اچھا شاعر ہونا دوسروں کو بھی معلوم ہوجاتا ہے۔

''واشگاف'' تاج الدین اشعرؔ رام نگری کے کلام کا نیا مجموعہ ہے۔ کلام کی خوبی اور خوب صورتی شروع سے آخر تک واشگاف ہے۔ شروع میں جو حمد ہے اور جو نعت ہے، وہ سب دل کش اور دل نشیں ہے۔ نعتیہ شاعری سے متعلق شاعر کے کئی دیوان ہیں۔ اس مجموعۂ کلام میں شروع میں حمد و نعت ہے لیکن اس کے پورے کلام میں حمد و نعت کی چاندنی اور خوش بو محسوس ہوتی ہے۔ جو غزلیں ہیں، وہ بھی اسی رنگ اور اسی آہنگ میں ہیں۔ نمونے کے طور پر صرف ایک غزل پیش کی جارہی ہے:

تمام صحنِ چمن کو لہو لہو کر کے
گیا ہے کون یہ توہینِ رنگ و بو کر کے

خزاں نے آج جو پوچھا مزاج کیسے ہیں
خجل تھے پھول بہاروں کی آرزو کر کے

دعائیں دیجیے کس منہ سے تیغِ قاتل کو
اٹھی جو میری وفاؤں کو سرخ رو کر کے

جبینِ عدل و مروت پہ داغ ہیں کتنے
کبھی تو دیکھیے آئینہ رو برو کر کے

متاعِ غم مجھے بخشی گئی تو کیا شکوہ
شراب دیتے ہیں اندازۂ سبو کر کے

چلے ہو چاک گریباں مرا رفو کرنے
ہر ایک چاک کو ناقابلِ رفو کر کے

مزا تو جب ہے کہ تم درمیاں سے ہٹ جاؤ
رقیب کو کسی دن رو برو کر کے

سلام کشتۂ جور و جفا شہیدوں پر
جو قتل گہہ سے اٹھے خون سے وضو کر کے

کہاں سے لائیے گجرات کے لیے آنسو
ابھی تو اٹھے ہیں ہم ماتمِ ”مئو“ کر کے

تاج الدین اشعرؔ کا کلام صنفِ غزل کی میزان پر پورا اترتا ہے۔ ایسی غزلیں بہت ملتی ہیں جن میں مطلع اور حسنِ مطلع ہو لیکن ایسی غزلیں کم ہوتی ہیں جنھیں سندِ مطلع کہا جائے۔ سندِ مطلع اصطلاحِ شاعری میں اس غزل کو کہتے ہیں جو مکمل طور پر مطلع میں لکھی جائے، اور مطلع اسے کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں۔ نمونے کے طور پر سندِ مطلع کی ایک غزل دیکھیے:

رسوا رہے تباہ رہے صیدِ غم رہے
پھر بھی ہم اہل بزم حریفِ ستم رہے

دورِ سبوئے گل رہے یا جامِ جم رہے
اب بزمِ مئے میں کوئی نہ کسی سے کم رہے

یہ تو نہیں کہ آپ کے الطاف کم رہے
ہم اپنی ہی خوشی سے رہینِ الم رہے

ان کی بھی آستینوں میں پنہاں صنم رہے
جو ساری عمر وقفِ طواف حرم رہے

گو ہر طرف نشاط کے ساماں بہم رہے
جو ان کے غم شناس تھے پابندِ غم رہے

تم نے رلادیا مجھے اس کا گلہ نہیں
آنسو تو پونچھ دو کہ وفا کا بھرم رہے

سب کچھ ہم اہلِ دل سے کوئی چھین لے تو کیا
کافی ہے گر یہ دولتِ لوح و قلم رہے

تاج الدین اشعرؔ کی غزلیات میں عجم کی حسنِ طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ شاعر صحنِ چمن میں بیٹھ کر اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر غزلیں نہیں کہتا ہے۔ اس کے اشعار میں حالاتِ حاضرہ کا عکس موجود ہے۔ جیسے کسی ندی کی سطحِ آب پر درختوں کی پرچھائیں موجود ہو۔ اگر کہیں

جراحتوں کا چمن لہلہا رہا ہے اور زخموں کے پھول کھل رہے ہیں تو اس کی تصویر بھی ان کی غزلوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں جذبے کی روح اور توانائی پائی جاتی ہے۔ ان سب کے ساتھ بندش کی صفائی، معانی کی خوب صورتی اور فکر کی لالہ کاری ہے۔ اور زبان و بیان کی بلندی اور رخشندگی بھی۔

جناب تاج الدین اشعرؔ کا نعتیہ کلام پہلے میری نظروں سے گذرا تھا۔ میرے ذہن نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ایک بلند پایہ فنکار اور بہت اچھے شاعر ہیں۔ اور پھر اب ان کی غزلیات کو سرمۂ چشم بنانے کا موقع ملا تو ان کے اشعار آنکھوں کے راستے سے دل میں اتر گیے۔ اور اچھا شعر وہی ہے جو تیرِ نیم کش کی طرح دل میں پیوست ہوجائے، جو جذبات میں ہلچل پیدا کردے۔ روح میں ارتعاش پیدا کردے اور پھر اٹھا کر اس خواب آگیں فضا میں لے جائے جہاں مادیت کا گذر نہ ہو، جسمانیت کا سفر نہ ہو۔ جہاں روحانیت میں نورانیت ہو اور انسان محسوس کرے کہ وہ چاند تاروں کے بن میں اور ستاروں کی انجمن میں آگیا ہے۔ تاج الدین اشعرؔ نے جو غزلیں کہی ہیں، ان میں وہی درد اور کسک ہے جو تیر لگنے کے بعد چشمِ غزال میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے لطیف تخیل کو غزل کا لباسِ حریر پہنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک اچھی غزل میں پائی جاتی ہیں۔ وہ بہت ممتاز نعت گو شاعر ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ بہت ممتاز غزل گو شاعر بھی ہیں۔ یہ دنیا بہت آسانی کے ساتھ کسی کا اعتراف نہیں کرتی لیکن اگر ناقد میں انصاف اور معروضیت کی خوبیاں موجود ہوں تو اس کو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اردو ادب اور تنقید میں جن کو اساطین سمجھا جاتا ہے، ان کی بہت سی باتیں راقمِ حروف کو سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ کیونکہ ان میں ژولیدہ بیانی ہوتی ہے۔ اپنے ہی ذوق پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ تاج الدین اشعرؔ کو یہ راقم بہت بڑا شاعر یا چند بڑے شاعروں میں ایک لکھنے ہی والا تھا کہ ایک نوائے سروش کانوں میں آئی کہ تنقید و ادب کی دنیا میں بہت واشگاف لفظوں میں درجہ بندی اور صف بندی نہیں کی جاتی ہے، اس لیے قلم چلتا ہوا اس منزل پر آکر رک گیا۔ میں یہ بات لکھوں یا نہ لکھوں، شاعری خود کو منوالیتی ہے۔

مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

مولانا محمد حنیف ندوی
ایک صاحب فضل وکمال ادیب اور مصنف

مولانا محمد علاء الدین ندوی
استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

برصغیر میں مکاتب و مدارسِ دینیہ کا ایک وسیع نیٹ ورک ہے، جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ یہ مکاتب و مدارس اردو کی بنیادی تعلیم اور فروغ کے مقصد سے قائم نہیں ہوئے ہیں، پھر بھی انھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو کی لاج رکھی ہے، بلکہ یہ اردو کے لیے وقف اداروں اور سرکاری اکیڈمیوں سے بڑھ کر اردو کے فروغ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس میں صوبوں کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ بلکہ ہندستان کے تو سارے ہی صوبوں میں مدارس کے بچوں کو اردو سکھا کر اس قابل بنادیا جاتا ہے کہ اردو کتابوں کا آسانی سے مطالعہ کرسکیں۔ ہاں ان مدارس میں اردو کا کوئی شعبہ نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کا معیارِ تعلیم عموماً انٹر کے مساوی ہوتا ہے اور اس معیار کے تعلیمی نظام میں کسی علم وفن کے شعبے ڈھونڈھنا قرینِ عقل وخرد نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مدارس اپنے ذریعۂ تعلیم، اپنے دینی پروگراموں، طلبہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں، نصابی کتب کی روز افزوں نشر و اشاعت، مدارس سے شائع ہونے والے اردو کے رسائل وجرائد، طلبہ کی وال میگزین (جداری رسالے)، اردو میں بڑے پیانے پر دینی کتب کی تالیف وتصنیف اور نشر واشاعت کے حوالے سے اردو زبان فروغ پارہی ہے، بلکہ شیر خوار بچے کی طرح اس کی دایہ گری کی جارہی ہے۔

اردو کی پیدائش اور نشو ونما تو خیر صوفیا کی گود میں ہوئی ہی ہے، مگر اس کے اعلیٰ کلاسیکی ادب سے لے کر ترقی پسند تحریک تک کے اساطین واکابر کے ساتھ علما وفضلائے مدارس کی اتنی لمبی تعداد آبروئے اردو کی حفاظت وترقی کے لیے سینہ سپر رہی ہے کہ اگر ان ناموں کو اردو کی فہرست سے نکال دیا جائے تو اس کا جیب و دامن بڑی حد تک خالی نظر آئے گا۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالیؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، مولوی عبد الحق دہلوی، مولانا حسرتؔ موہانی، سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مولانا محمد حنیف ندوی اور اسلامی، تعمیری اور مقصدی ادب کے لیے

کوشاں اہلِ فکر و فن کو اردو زبان سے ذرا تھوڑی دیر کے لیے دور لے جائیے تو یہ زبان احساسِ محرومی سے تڑپ اٹھے گی۔

ندوۃ العلما کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

''ندوہ ہے زبانِ ہوش مند''

ندوۃ العلما نے بے شمار اردو کے مصنفین پیدا کیے۔ ایک مختصر مقالے میں تو ان فضلائے ندوہ کی اردو میں تصانیف اور ان کے مصنفین کا تذکرہ بھی سما نہ سکے گا۔ سو راقم نے کئی وجوہات کو مدنظر رکھ کر مولانا محمد حنیف ندوی کے بارے میں جو اہلِ علم کے ذہنوں سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں، کچھ لکھنے کا ارادہ کیا، تاکہ علمی دنیا اور اہلِ ذوق کے سامنے اوجھل ہوتی ہوئی اس شخصیت کا سرسری تعارف اور ان کی اردو نوازی کا ہلکا سا عکس آجائے۔

مولانا محمد حنیف ندوی اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنے دم سے ایک عہد تھے۔ ۱۰ر جون ۱۹۰۸ء میں گوجراں والا (حال پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ چار سال سرکاری اسکول میں تعلیم پائی اور ساتھ میں ناظرۂ قرآن بھی پڑھ لیا۔ حکیم ظہور الدین سے فارسی پڑھنے کے بعد مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجراں والا کے حلقۂ درس میں شامل ہوگیے۔ مروجہ علوم کی ساری کتابیں پڑھ کر درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ۱۹۳۵ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی کے ۴۸ سالہ دورِ تدریس میں محمد حنیف جیسا ذہین و فطین طالبِ علم ان کے حلقۂ درس میں نہیں آیا۔

فراغت کے بعد ۱۹۲۵ء ہی میں مولانا محمد اسماعیل سلفی نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام سفارشی خط دے کر آپ کو ندوۃ العلما میں داخلے کے لیے بھیج دیا۔ اس دانش گاہِ علم و عرفان اور مرکزِ فکر و فن میں جو قدیم صالح اور جدید نافع کا سلوگن لے کر اٹھا تھا، مولانا محمد حنیف ندوی کی زندگی کا ایک نیا موڑ تھا۔ یہاں رہ کر آپ نے ابتدائی تین سال میں نصابی کتب کی تکمیل کی اور مولانا عبدالرحمٰن ندوی، مولانا حیدر حسن ٹونکی اور شمس العلما مولانا حفیظ اللہ سے خصوصی استفادہ کیا۔ پھر دو سال میں قدیم و جدید تفاسیر کا جان توڑ محنت اور لگن سے مطالعہ کر کے تخصص کا اعزاز حاصل کیا۔ عربی زبان و ادب بھی آپ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ لکھنؤ کی زبان اور تہذیب کا گہرا اثر قبول کیا۔ کچھ عرصہ دارالمصنفین میں قیام کے بعد ۱۹۳۰ء میں گوجراں والا واپس آگیے۔

ان دنوں گجراں والا میں ایک سیاسی جماعت ''نوجوان بھارت سبھا'' کا بڑا زور تھا۔ آپ اس میں شامل ہوگیے اور انگریزی حکومت کے خلاف خوب تقریریں کیں، نتیجے میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور چھ ماہ کے لیے جیل بھیج دیئے گیے۔ رہائی کے بعد لاہور کی مسجد مبارک (اہلِ حدیث کی مسجد) میں خطابت کے منصب پر فائز ہوئے۔ خطابت کے علاوہ روزانہ مغرب کے بعد درسِ قرآن بھی آپ کے فرائض میں شامل تھا۔ یہ مسجد اسلامیہ کالج سے متصل تھی، یہاں کے اساتذہ اور طلبہ اسی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے، اور مولانا

کے جمعے کے خطبے اور بعد نمازِ مغرب کے درس سے مستفید ہوا کرتے تھے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے جمعے کا خطبہ اور مغرب بعد کے درس دونوں کا آغاز سورۂ فاتحہ سے کیا۔ چند ہی ہفتوں میں لاہور شہر میں آپ کے درس کی دھوم مچ گئی۔ لوگ کثیر تعداد میں شریک ہونے لگے۔ آپ سے پہلے لاہور میں درسِ قرآن کے دو حلقے قائم تھے۔ ایک مولانا احمد علی صاحب کا شیراں والا گیٹ کی مسجد میں اور دوسرا شاہی مسجد کے سابق خطیب مولانا غلام مرشد کا سنہری مسجد، رنگ محل میں۔ اب تیسرا حلقہ مسجدِ مبارک میں مولانا محمد حنیف ندوی کا قائم ہوا۔ یہ حلقہ اس اعتبار سے پہلے دونوں حلقوں سے منفرد تھا کہ اس میں قدیم اسلوبِ درس کے علاوہ جدید انداز بھی کارفرما تھا اور علوم وفنون نے جو پھیلاؤ اختیار کرلیا ہے، اس کا تذکرہ نہایت مؤثر اور اچھوتے انداز میں ہوتا تھا۔ نیز قرآن کے جن جن پہلوؤں کو مستشرقین نشانۂ اعتراض بناتے ہیں، اس کی وضاحت کی جاتی تھی اور معترضین کا نئے اسلوبِ کلام میں جواب دیا جاتا تھا۔

آپ نے اٹھارہ سال پابندی سے یہ خدمت انجام دی۔ اس دوران روزانہ کے درس میں تین بار قرآنِ کریم کی تفسیر کا درس مکمل ہوا۔ اور جمعے کے خطبے میں دوسری بار درس مکمل ہوا ہی چاہتا تھا کہ سورۃ التین کی تفسیر تک پہنچ کر یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

مولانا اپنے درس میں نئے نئے نکات بیان کرتے، سامعین کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیتے۔ مولانا کے کامیاب درس اور زبان و بیان کی حلاوت سے متاثر ہوکر جدید طبقہ بھی جمعے کی نماز اور درسِ قرآن میں مشتاقانہ حاضر ہونے لگا۔ مولانا ظفر علی خاں جیسا قائد ورہنما بھی پابندی سے حاضر ہوتا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ''مولانا محمد حنیف ندوی کے درسِ قرآن اور خطبۂ جمعہ میں اردو زبان کے لیے حاضر ہوتا ہوں، یہ کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی زبان بولتے ہیں''۔

مولانا محمد حنیف ندوی ایک اصولی اور حق پسند انسان تھے۔ ان میں کم گوئی اور راست گوئی دونوں چیزیں تھیں۔ وہ علم وحلم کے پیکر تھے اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک، اپنی دھن کے پکے، علم کے دھنی، سرگرم وفعال اور دراک ونباض تھے۔ آپ نے سلجھا ہوا دماغ اور دلِ دردمند پایا تھا۔ اللہ نے آپ کو ذہانت وذکاوت اور غیر معمولی قوتِ حافظہ سے نوازا تھا۔ آپ کا قیمتی مطالعہ ہی آپ کا سرمایۂ علم تھا۔ قرآن و حدیث میں نظر بڑی گہری تھی۔ تاریخ پر تنقیدی اور بصیرت مندانہ نگاہ ڈالتے تھے۔ مطالعے کی وسعت اور دریائے علم کی شناوری نے آپ کو اپنے وقت کے ممتاز علما، نامور محققین اور پایے کے مصنفین کی صف میں کھڑا کردیا تھا۔ مولانا کا ایک واقف کار کہتا ہے:

''مولانا محمد حنیف ندوی اپنے علمی مرتبے کے لحاظ سے صاحبِ کمال تھے۔ تفسیرِ قرآن، حدیث، فقہ الحدیث، تاریخ وسیر، اسماء الرجال، ادب وانشا، فقہ واصولِ فقہ، فلسفہ و

کلام،لغت وعربیت اور صرف ونحو میں عبور واستحضار حاصل تھا۔ فلسفۂ قدیم وجدید پر آپ کا مطالعہ بہت زیادہ وسیع تھا۔آپ کے تبحرِ علمی اور صاحبِ فضل وکمال ہونے کی وجہ سے حکومتِ پاکستان نے آپ کو اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن نامزد کیا تھا۔ آپ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۲ء تک اس کے رکن رہے"۔

(بحوالہ ماہنامہ اسوۂ حسنہ، جامعہ ابی بکر الاسلامیہ، کراچی، ماخوذ از اردو ویکیپیڈیا)

مولانا نہ صرف یہ کہ برصغیر کی سیاسی، قومی، ملی، فکری اور دینی وعلمی تحریکات کے منظر وپس منظر سے آگاہ تھے، بلکہ اپنی ناقدانہ رائے بھی رکھتے تھے۔اسی طرح عالمِ اسلام کی دینی وفکری، مذہبی وقومی اور سیاسی تحریکات کی اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی فاضل اور ہمہ جہت شخصیت جب کاغذ کے صفحات پر اپنے فکر ونظر کی جولانیاں دکھائے گی تو اس میں کیسی گیرائی، معنویت اور اپیل کی صلاحیت ہوگی۔

مولانا نے جب تصنیفی زندگی کی جولان گاہ میں قدم رکھا نہیں، فراٹے بھرنا چاہا تو تفسیرِ قرآن سے آغاز کیا۔۱۹۳۰ء سے وہ اپنے درسِ قرآن کے توسط سے اور اس کی ضیابار کرنوں سے اپنے سامعین کے دلوں کو منور کررہے تھے۔اب ۱۹۳۴ء میں دیکھیے انھوں نے کیا علمی کارنامے انجام دیئے۔

۱- انھوں نے 'سراج البیان' کے نام سے تفسیر کی پانچ جلدیں لکھیں اور اردو داں طبقے کے سامنے پیش کیں۔اس کی تیاری میں مصنف نے تفسیر کی اکثر ممتاز ومشہور اور جدید وقدیم کتب سے مدد لی ہے۔اللہ نے اس تفسیر کو ایسی مقبولیت بخشی کہ یہ پندرہ، سولہ بار چھپ چکی ہے۔مولانا نے جب یہ تفسیر لکھی تھی، اس وقت ان کی عمر ۲۴ یا ۲۵ برس کی تھی۔اس تفسیر کی چند خاص باتیں حسبِ ذیل ہیں:

☆ ہر صفحے میں اہم مضامین کی تبویب کردی گئی ہے۔

☆ نیچے حلِ لغات دے دیئے ہیں۔

☆ ضعیف اقوال اور کمزور آرا کو اپنی تفسیر میں قریب آنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

☆ قدیم علوم سے استفادے کے ساتھ ہی جدید علمی افکار کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پنجاب کے صرف دو علما نے پورے قرآنِ کریم کی جامع تفسیر لکھی ہے اور دونوں مسلکِ اہلِ حدیث سے مربوط رہے ہیں۔پہلے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تفسیر ثنائی لکھی اور دوسرے مولانا محمد حنیف ندوی نے سراج البیان کی تکمیل کی۔

۲- مولانا فتح محمد خاں جالندھری کا ترجمۂ قرآن (خصوصاً پاکستان میں) بے حد مقبول ومتداول رہا ہے۔اس کے ناشر کی درخواست پر مولانا محمد حنیف ندوی نے پہلی بار اس پر نظرِ ثانی فرمائی ہے۔

۳- خدمتِ قرآن کے ضمن میں مولانا کی ایک خدمت یہ بھی ہے کہ " **مطالب القرآن في ترجمة القرآن** "

جو سید محمد شاہ کا ترجمہ ہے، اس پر ''مجلسِ فکر و نظر'' نے ایک کمیٹی کے ذریعے نظرِ ثانی کروائی، اس کمیٹی میں تین حضرات شامل تھے، جس میں سرِ فہرست مولانا محمد حنیف ندوی تھے، اس نظرِ ثانی شدہ مسودہ کی تصدیق وقت کے آٹھ ماہر علما نے کی تھی، جن میں سے پانچ کا تعلق ندوۃ العلما یا لکھنؤ سے تھا۔ پانچوں اشخاص کے اسمائے گرامی یوں ہیں: علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی لکھنوی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی ندوۃ العلما، مولانا عبد الحلیم صدیقی لکھنوی، مولانا محمد شبلی ندوۃ العلما لکھنؤ۔

۴- مولانا نے قرآنی موضوعات پر متعدد مقالات ماہنامہ ''حقیقتِ اسلام'' میں لکھے، جو بڑی دلچسپی سے پڑھے گیے۔

۵- 'قرآن کی مختلف آیات کی تفسیر' کے عنوان سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مولانا نے قرآنِ مجید کی تفسیر کا آغاز کیا۔ منتخب آیات کا منشا و مدعا بیان کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

''ہم اس شمارے سے اس نئے اور مستقل باب کو شروع کر رہے ہیں۔ تفسیرِ آیات کا انتخاب ان معنوں میں ہے کہ اختصار کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم کن آیات کو اپنے ذوق کی رعایتوں سے آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں، ورنہ یہاں متعارف معنوں میں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں تو ایک ایک آیت جانِ معنیٰ اور روحِ انتخاب ہے۔ اس باب میں ہم صرف ان آیات کو لائیں گے جن کی ادبی، نحوی، یا کلامی و فقہی اہمیتوں کو اجاگر کر سکیں۔ مقصود یہ ہے کہ ہماری موجودہ پود کے دلوں میں قرآن کی عظمت کا صحیح صحیح احساس کروٹ لے اور انھیں یہ معلوم ہو کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کی اس کتاب میں کتنا اعجاز، کتنے معانی اور فکر و عمل کا کتنا نکھار مضمر ہے۔ امید ہے کہ ہمارے قارئین اسے دل چسپی سے پڑھیں گے''۔

۶- ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کا ماہانہ مجلّہ ''ثقافت''، بعد میں یہی رسالہ تبدیل ہو کر رسالہ ''المعارف'' ہو گیا۔ مولانا ان دونوں رسالوں میں قرآن کی تفسیر لکھتے رہے۔ اس طرح ان تینوں رسالوں میں منتخب آیات کی جو مولانا نے تفسیر فرمائی، اس کی ضخامت پانچ سو صفحات تک جا پہنچی ہے۔

۷- مولانا طویل عرصے تک ٹیلی ویژن کے ''بصیرت'' پروگرام میں قرآنِ کریم کی تفسیر بیان فرماتے رہے۔ مگر یہ زبانی سلسلہ تحریری طور پر محفوظ نہ رہ سکا۔

۸- ''چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں'' یہ قرآن کی روشنی میں سیرتِ طیبہ کا مجموعہ ہے جو ''الاعتصام'' کی ۲۷ قسطوں میں چھپ چکا ہے۔ پھر بھی موضوع کی تکمیل نہ ہو سکی۔ یہ کتاب ۲۹/ابواب اور ۳۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۹۹ء میں علم و عرفان پبلشرز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔

۹- ''مطالعۂ قرآن'' کے نام سے مولانا نے قرآنی موضوعات پر یہ محققانہ کتاب لکھی ہے، جو متعدد عنوانات پر پھیلی ہوئی ہے اور تین سو سے زائد صفحات پر بکھری ہوئی ہے۔ اس

کے عنوانات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے کتاب کی معنویت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ عناوین حسب ذیل ہیں:

(۱) قرآن کا تصورِ وحی وتنزیل (۲) قرآنِ مجید اور کتبِ سابقہ (۳) اسفارِ خمسہ (۴) عہد نامہ جدید اور اناجیلِ اربعہ (۵) قرآنِ حکیم اور اس کے اسما و صفات (۶) قرآنی سورتوں کی قسمیں اور ان کی ترتیب (۷) قرآنی سورتوں کی زمانی و مکانی تقسیم (۸) جمع و کتابتِ قرآن کے تین مراحل (۹) قرآنِ حکیم کی لسانی خصوصیات (۱۰) اعجازِ قرآن اور اس کی حقیقت (۱۱) محتویاتِ قرآن (۱۲) مشکلاتِ قرآن (۱۳) قرآن کے رسم الخط کے بارے میں نقطۂ اختلاف (۱۴) تفسیر (۱۵) تفسیر کے دو مشہور مدرسۂ فکر: اصحاب الحدیث اور اہل الرائے (۱۶) اولیاتِ قرآن۔

۱۰- ''لسان القرآن''۔ اگر تفسیر ''سراج البیان'' مولانا کے ذخیرۂ علم وعرفان کا درِ آبدار ہے جسے ۲۴ سال کے جوانِ رعنا کے قلمِ گہربار نے تابانی بخشی ہے تو لسان القرآن حروفِ تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے قرآنِ کریم کی توضیحی لغت ہے، جس کو صفحاتِ قلم پر منقش کرنے کا عزم انھوں نے ۱۹۸۲ء میں کیا تھا، جب گردشِ ایام کے تھپیڑوں نے آپ کو ساحلِ زندگی کی پچھہتر ویں منزل پر پہنچادیا تھا۔ اس عمر میں مولانا کا جسم بوڑھا ہوگیا ہو تو ہوگیا ہو، مگر آپ کے افکار ہمیشہ تازہ دم رہے۔ قلم ہمیشہ جواں سال رہا اور عزم وحوصلہ ہمیشہ منزلِ جاناں کی راہ پہ سرگرمِ سفر رہا۔

لسان القرآن کی دو جلدیں ح ب ب (حب) تک آپ لکھ سکے۔ پھر بیماری کے باعث قلم کی رفتار رک گئی۔ ۱۹۸۷ء میں کتابِ زندگی کے خاتمے کے بعد سرگرمیِ حیات کا سلسلہ بند ہوگیا۔ لسان القرآن کی دو جلدیں جو ۹۳۷ صفحات پر مشتمل ہیں، شائع ہوچکی ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۸۳ء میں اور دوسری جلد ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

دیگر تصانیف

مولانا کا زرخیز قلم گوناگوں موضوعات پر علم وفکر کے گلاب وسوسن، چمبیلی اور رات کی رانی سے پھلواری سجاتا رہا۔ اس پھلواری کے چند پھولوں کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے:

۱۱- ''مرزائیت نئے زاویوں میں'' ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مولانا کے دورِ ادارت میں چھپنے والے مقالات کا مجموعہ ہے، جو مرزائیت سے متعلق نئے نئے زاویوں سے بحث کرتا ہے۔ مقالات کا یہ مجموعہ ۱۹۵۲ء میں کتابی شکل میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکا ہے۔ دوسری بار اسے طارق اکیڈمی لاہور نے شائع کیا ہے۔

۱۲- ''مسئلۂ اجتہاد'' یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ کل صفحات ۲۰۰ ہیں۔

۱۳- ''افکارِ ابنِ خلدون'' یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ کل صفحات ۲۳۳ ہیں۔

۱۴- ''افکارِ غزالی'' یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے صفحات ۵۱۴ ہیں۔

۱۵- ''سرگزشتِ غزالی''، یہ امام غزالی کی تصنیف '' **المنقذ من الضلال** '' کا ترجمہ ہے، جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے کل صفحات ۱۹۶ ہیں۔

۱۶- ''تعلیماتِ غزالی''، یہ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کے ان ابواب کا ترجمہ ہے جن کا تعلق نماز، زکاۃ، روزہ اور حج سے ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۶۲ء میں چھپا۔ اس کے کل صفحات ۵۶۰ ہیں۔

۱۷- ''مکتوباتِ مدنی''، مشہور عالم اسماعیل بن عبداللہ آفندی رومی مدنی نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفسار کیا تھا۔ اس مکتوب میں شاہ صاحب نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔ اسے مکتوبِ مدنی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے اس علمی کتاب کا سلیس اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے کل صفحات ۳۶ ہیں۔

۱۸- ''عقلیاتِ ابنِ تیمیہ''، یہ کتاب امام ابن تیمیہ کے فلسفے اور منطق سے متعلق ہے۔ اس کے کل صفحات ۳۸۵ ہیں۔ اور پہلی بار ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

۱۹- ''مسلمانوں کے عقائد و افکار''، علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور متکلمِ اسلام ہیں۔ ان کی کتاب '' **مقالات الإسلاميين** '' بڑی شہرت کی حامل اور نہایت وقیع تصنیف ہے اور دو جلدوں میں دست یاب ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے شگفتہ اردو میں اس کا ترجمہ کر کے اردو داں طبقے پر بڑا احسان کیا ہے۔ دونوں جلدوں کے لیے الگ الگ مقدمہ لکھا ہے۔ پہلی جلد ۱۹۶۸ء میں چھپی ہے، اس کے کل صفحات ۳۸۰ ہیں۔ اور دوسری جلد ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اور اس کے کل صفحات ۳۲۴ ہیں۔

۲۰- ''اساسیاتِ اسلام''، اس کتاب میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام ہمارے سارے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور روحانی مسائل کا حل باحسنِ وجوہ پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کے نو ابواب ہیں۔ صفحات کی تعداد ۳۰۰ ہے۔ اس کی تاریخِ اشاعت ۱۹۷۳ء ہے۔

۲۱- '' **تهافت الفلاسفة** ''، غزالی اور ابن رشد کی حیثیت حکمت و فلسفہ کے امام و مجتہد کی ہے۔ یونانی فلسفے کے رد میں امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ لکھی تو ابن رشد نے امام صاحب کی کتاب کی تردید میں '' **تهافت التهافت** '' تصنیف کی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے امام غزالی کی اس شاہکار تصنیف کا رواں، سلیس اور شگفتہ اردو میں ترجمہ اور تلخیص فرمائی ہے۔ پھر اس پر ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں امام غزالی اور ابن رشد کے فلسفیانہ افکار و نظریات کا جچا تلا محاکمہ کیا ہے۔ مولانا کی نظر چونکہ منطق و فلسفہ میں گہری تھی، اس لیے دقیق مباحث کو بھی اردو کے خوب صورت قالب میں ڈھال

دینا آپ کے لیے آسان کام تھا۔ ۲۲۵ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۷۴ء میں چھپی ہے۔

۲۲- ''مطالعۂ حدیث''، مولانا مستشرقین اور مستشرقین کے خوشہ چینوں کو دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ حدیث کے خلاف ہرزہ سرائیوں کو علمی اور تحقیقی رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر آپ سے رہا نہیں گیا اور آپ کی دینی حمیت و غیرت نے آپ کو بے قرار کر دیا۔ چنانچہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی فکر کی ایک ایک بنیاد پر تیشہ چلایا اور اپنے مضبوط دلائل سے ثابت کیا کہ حدیث و سنت کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا کام صحاحِ ستہ کی تدوین تک ایک خاص تسلسل لیے ہوئے ہے۔ اس ابطالِ باطل اور احقاقِ حق کے علاوہ بھی حدیث کے متعلقہ علوم پر روشنی ڈالی ہے۔ رجال و رواۃ کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی بھرپور تشریح کی ہے۔ ان اصولوں کی بھی وضاحت کی ہے جن سے محدثین نے متنِ حدیث کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے۔ یہ کتاب پندرہ عنوانات پر مشتمل ہے:

(۱) قرآنِ حکیم اور اطاعتِ رسول (۲) سنت کن حقائق سے تعبیر ہے (۳) سنت عہدِ نبوی میں (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوبِ دعوت و ارشاد (۵) صحابہ اور تابعین (رضی اللہ عنہم) کے دور میں علمِ حدیث کی اشاعت کا جذبہ (۶) صحابہ اور تابعین (رضی اللہ عنہم) کے زمانے میں اشاعتِ حدیث کے اسباب و عوامل (۷) روایت کی دو قسمیں (۸) تدوینِ حدیث (۹) حدیث کے بارے میں فنِ جرح و تعدیل (۱۰) فتنۂ وضعِ حدیث اور محدثین کی مساعی جمیلہ (۱۱) اصطلاحاتِ حدیث (۱۲) علومِ حدیث (۱۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (۱۴) امام زہری رحمۃ اللہ علیہ (۱۵) کتبِ حدیث اور ان کے مؤلفین۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن کے بعد حدیث و سنت سے مولانا کے قلبی شغف اور دینی و روحانی وابستگی اور منکرینِ حدیث سے نفرت کے جذبۂ صادق نے اس موضوع پر انھیں لکھنے پر مجبور کیا۔ یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں چھپی اور اس کے کل صفحات ۲۳۰ ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی کا تعلق صحافت سے بھی رہا اور متعدد رسائل و جرائد کے آپ مدیر رہے۔ جس کی تفصیل یوں ہے:

۱- ماہنامہ 'زندگی' لاہور۔ مولانا کچھ عرصہ اس کے مدیر رہے۔

۲- ہفت روزہ 'مسلمان' سوہدرہ۔ اس کے مالک اور مدیر مولانا عبدالمجید سوہدروی تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی اس کے معاون مدیر تھے۔ آپ اس اخبار کو دینی اور علمی بنانا چاہتے تھے اور سوہدروی صاحب اس کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے آپ نے علاحدگی اختیار کر لی۔

۳- ہفت روزہ 'الاخوان' گوجراں والا، انجمن اہلِ

حدیث گوجراں والا نے اسے جاری کیا تھا اور مولانا کو اس کا اڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا ایک ہی شمارہ شائع ہوا جو پہلا بھی تھا اور آخری بھی۔

۴- ہفت روزہ 'الاعتصام' گوجراں والا، لاہور (اگست ۱۹۴۹ء میں اس کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تھا)۔ مولانا محمد حنیف ندوی اس کے پہلے اڈیٹر تھے اور چار سال (جون ۱۹۵۳ء) تک اس کے اڈیٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔

مولانا کی یہ ساری تصنیفی، علمی، دینی اور فکری و عملی کاوشیں آپ کے تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ کا آئینہ دار ہیں۔ آپ کی شخصیت ہمہ جہتی شان کی مالک ہے۔ آپ عالمِ دین بھی ہیں، فلسفی اور منطقی بھی، مؤرخ بھی ہیں اور محقق بھی، مترجم بھی ہیں اور نقاد بھی، مفسر قرآن بھی ہیں اور حدیث وسنت کے محافظ و پاسبان بھی، زبانِ ہوش مند کے امین بھی ہیں اور بقول مولانا ظفر علی خاں تسنیم و کوثر میں دھلی زبان کے لکھنے اور بولنے والے بھی۔

آپ کے اندازِ بیان میں شیرنی و شگفتگی کے ساتھ سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ ادبی لطافت اور زبان کی حلاوت کبھی زبان وقلم کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اردو یکی پیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے: ''مولانا ندوی کا مجموعی اسلوب منطقی ہے، مگر خشک و بے کیف نہیں۔ ان کی تحریروں میں ادیبانہ رنگ کی جھلکیاں خاص طور سے محسوس کی جاسکتی ہیں۔ مسلک کے لحاظ سے اہلِ حدیث ہیں، مگر ان کی تحریروں میں اس خشونت اور معرکہ آرائی کو کہیں دخل نہیں جو عموماً اس گروہ کی تحریروں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بلا کی شائستگی اور شستگی ہے۔''

مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں: ''مولانا محمد حنیف ندوی قدیم وجدید کے پیکرِ حسین اور صاحبِ فضل وکمال بزرگ تھے۔ مفسرِ کتابِ ہدی، فنونِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر، خزانۂ علومِ قرآن، محبِ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم، دلدادۂ حدیث نبوی، حاضر جواب، مقرر شیریں بیان، خطیب نکتہ طراز، خلوت گزین مجمعِ کمال اور گوشہ نشین محفل آرا تھے۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے بے نیاز، دولت وثروت سے مستغنی، لوگوں کی داد وتحسین سے بے پروا، عربی کے ادیب، اردو کے صاحبِ طرز مصنف، متوکل علی اللہ، مجسمۂ فہم وتدبر، اسلامی فلسفے میں یکتا، عمرانیات وعلومِ حاضرہ میں منفرد اور علم ومطالعہ کے علاوہ ہر شے سے بے تعلق، اس قناعت پیشہ صاحبِ علم وہنر نے ۱۲ر جولائی ۱۹۸۷ء کو نمازِ مغرب کے بعد وفات پائی اور دوسرے دن ۱۳ر جولائی کو انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا''۔

ڈاکٹر سعادت سعید اپنی کتاب ''مولانا محمد حنیف ندوی ایک تعارفی مطالعہ'' میں رقم طراز ہیں:

''عربی زبان میں استعداد اتنی بڑھ گئی کہ کانپور کے ایک جلسے میں ''قرآن کی زبان کا عربی ادب پر اثر'' کے موضوع پر آدھ گھنٹہ عربی زبان میں تقریر کی۔ اس جلسے کی

صدارت حکیم اجمل خاں کررہے تھے۔علامہ سید سلیمان ندوی نے ان (مقرر) کا تعارف کرایا۔حکیم صاحب نے فرمایا:علم میں بڑھے ہو،جسم میں بھی بڑھو،لیکن مولانا بچپن ہی سے دھان پان ہی رہے،بڑے باوقار اور صاحب الرائے عالم تھے"۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے کبھی اردو زبان وادب کی خدمت کا اعلان واشتہار نہیں دیا۔اعلان واشتہار کیا معنی،ان کی زبان سے یہ دعوی تک نہیں سنا گیا کہ انھوں نے اردو زبان کی خدمت کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے،یا اس کے گیسو سنوار رہے ہیں، مگر دینِ اسلامی کی خدمت،کتاب وسنت کی ترویج واشاعت، شرک وبدعت کی تردید،علم وفکر کی پاسداری اور تصنیف وترجمے کے میدان میں اپنے قلم کی فتح مندیوں کے ساتھ اردو زبان کی آبیاری زندگی بھر کرتے رہے،اس کے لیے مولانا نے کتنی پتا ماری کی ہوگی،اس کا اندازہ صرف اب تک کی ان کی مطبوعہ کتب سے لگائیے جن کے صفحات کی تعداد لگ بھگ ۸۱۲۶ بنتی ہے۔رسائل وجرائد کے بہت سے مطبوعہ مضامین ومقالات اس کے سوا ہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ مولانا اٹھارہ سال تک روزانہ اور ہر خطبۂ جمعہ میں درسِ قرآن پابندی کے ساتھ دیتے رہے۔اور بقول مولانا ظفر علی خاں "تسنیم وکوثر میں دھلی ہوئی زبان بولتے رہے اور موتی رولتے رہے۔

مولانا بجا طور پر ندوۃ العلما کے ان مایہ ناز فرزندوں کی طلائی زنجیر کی ایک کڑی تھے،جنھوں نے اپنے دینی،علمی،فکری،دعوتی اور قومی وملی کارناموں سے ندوۃ العلما کا نام روشن کیا۔اس کام کے لیے ہمیشہ زبانِ ہوش مند کا سہارا لیا اور اسلامیانِ برصغیر کے لیے سرمایۂ افتخار بنے رہے۔ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی،مولانا عبد السلام ندوی،مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی،مولانا سید ریاست علی ندوی،مولانا محمد ناظم ندوی،مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی،مولانا عبد السلام قدوائی ندوی،مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی،مولانا محمد عمران خاں ندوی،مولانا مسعود عالم ندوی،مولانا ابواللیث ندوی،مولانا عبد اللہ عباس ندوی،مولانا مختار احمد ندوی، مولانا ہدایت اللہ ندوی،مولانا رئیس احمد جعفری ندوی، مولانا محمد حنیف ندوی،مولانا محمد جعفر پھلواروی ندوی، مولانا عبد الباری ندوی،ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی،مولانا شہاب الدین ندوی،مولانا محمد ثانی حسنی ندوی اور مولانا محمد الحسنی ندوی وغیرہ۔

اُردو زبان وادب اور مدارسِ عربیہ

ڈاکٹر تابش مہدی

اردو زبان وادب کا مدارسِ عربیہ سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ کوئی آج کا نہیں، بہت پرانا ہے۔ بلا مبالغہ اِس رشتے کو کئی صدیوں کو محیط قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ مدارس میں ہمیشہ ذریعۂ تعلیم اردو ہی رہی ہے۔ ہندستان کا بڑا صوبہ اُتر پردیش کسی زمانے میں دبستانی طور پر اُردو کا مرکز تصور کیا جاتا رہا ہے اور لسانی طور پر بھی اس کی اپنی ایک حیثیت رہی ہے۔ لیکن تقسیمِ ملک کے بعد بعض سازشوں کے نتیجے میں یہاں کے سرکاری اسکولوں سے یک لخت اُردو کا خاتمہ ہوگیا۔ آج پوری ریاست میں سرکاری سطح پر ایک بھی اردو اسکول نہیں ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہاں سے اردو کو نیست ونابود ہوجانا چاہیے تھا۔ لیکن چوں کہ تمام چھوٹے بڑے عربی مدارس میں اردو پڑھائی جارہی ہے۔ پہلی سے لے کر آخری کلاس تک طلبہ کو اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور اردو ہی کے ذریعے انھیں پڑھایا جاتا ہے۔ مسجدوں میں شبینہ و صباحی مکاتب قائم ہیں۔ وہاں بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ انھیں اردو میں تقریر وتحریر کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس لیے عمومی طور پر یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس ریاست میں اردو یتیم ویسیر یا بے یار و مددگار ہوچکی ہے۔ یہ مدارس کا ایسا کارنامہ ہے، جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اردو متحدہ ہندستان میں بھی بہ کثرت بولی، سمجھی اور لکھی جانے والی زبان تھی اور آج بھی تقریباً ہر ریاست میں اسے بڑی تعداد میں بولنے، سمجھنے اور لکھنے والے موجود ہیں۔ آئے دن اردو زبان میں بے شمار کتابیں چھپ رہی ہیں، جرائد و رسائل شائع ہورہے ہیں اور گھر گھر روزنامے، ہفت روزے اور دوسری نوعیت کے اخبارات و رسائل پہنچ رہے ہیں۔ اِن سب کا کریڈٹ مدارس ہی کو پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ایک مضمون کے طور پر جو طلبہ اردو پڑھتے ہیں یا اس میں ایم۔ اے یا پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں، زیادہ تر وہی طلبہ ہوتے ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم مدارس یا مکاتب میں ہوئی ہوتی ہے۔ جو لوگ مدارس یا مکاتب کے بغیر کسی اور ذریعے سے اردو کی سند حاصل کرکے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں آئے ہیں اور اونچی اونچی ڈگریاں لے کر لیکچرر، ریڈر یا پروفیسر ہوگیے ہیں، ان میں سے بڑی تعداد اردو زبان وادب کے لیے مضحکہ خیز صورت اختیار

کرگئی ہے۔ایسے ناقدوں اور پروفیسروں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھیں فاعل ومفعول، واحد وجمع اور تذکیر وتانیث کا بھی شعور نہیں ہے۔ تلفظات ومخارج کی بات تو دور کی رہی۔ اِن کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے جن اساتذہ یا ناقدوں کی زبان درست ہے، وہ یا تو مدارس سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں، یا خانگی وخاندانی طور پر اُنھیں یہ چیز ورثے میں ملی ہوئی ہے۔یا کسی خاص شخصیت نے انھیں اپنی خصوصی توجہ سے نکھارا ہے۔ مطلقاً کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے فیض یافتگان اردو زبان اوراردوادب دونوں کے لیے باعثِ رسوائی ہیں۔

مولانا تھانویؒ اوراردوزبان

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مبلغ، مصلح، مرشداور کثیر التصانیف مصنف کے ساتھ ساتھ اردو وفارسی کے اچھے سخن ور بھی تھے۔سیکڑوں کی تعداد میں ان کی کتابیں، اردو زبان وادب سے ان کے خصوصی شغف اور اس کی بے لوث خدمت کا زندہ وتابندہ ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ کتنے مرد اور عورتیں ان کی کتابیں پڑھ کر جہاں دینی تعلیمات سے آراستہ ہوئے ہیں، وہیں ان کی اردو خوانی اور اردو دانی کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔مولانا اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ فکرمنداور کوشاں رہے ہیں۔انھوں نے اردو زبان کی شرعی حیثیت پر ایک بڑا وقیع مضمون تحریر فرمایا تھا۔اس میں انھوں نے دنیا میں رائج مختلف زبانوں اور ان کے ڈھب کا جائزہ لیتے ہوئے اردو زبان وادب کی فوقیت اور برتری ثابت کی تھی۔مولانا نے اپنے متذکرہ مضمون میں عظمت وشرف کے اعتبار سے اولیت تو عربی کو دی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی زبان ہے۔رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ و سلم کی زبان ہے اور اہلِ جنت کی زبان ہے۔اس کے بعد چوں کہ مذہب وتصوف کی زیادہ تر کتابیں اس زمانے میں فارسی میں تھیں، اس لیے دوسرا درجہ انھوں نے فارسی کو دیا ہے۔ اردو زبان کو انھوں نے تیسرے درجے پر رکھا ہے۔مولانا نے اردو زبان کی فضیلت کے درجِ ذیل اسباب بیان فرمائے ہیں:

۱- عربی وفارسی سے اس کی جزوی قربت

۲- علومِ دینیہ اور تصوفِ صحیح ومقبول کا بڑا ذخیرہ اسی زبان میں موجود ہونا

۳- سہل وسلاست

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جتنی سہل، آسان اور سلیس یہ زبان ہے، اتنی کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ قرآنِ مجید کی آیات:

﴿ فإنما يسرناه بلسانك لتبشر به المتقين و تنذر به قومًا لُدًّا ﴾ (مریم:۹۷)

پس اے نبی! اس کلام کو ہم نے آسان کرکے تمہاری زبان میں اسی لیے نازل کیا ہے کہ تم پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرادو۔

اور

﴿ فإنما يسرناه بلسانك لعلهم يتذكرون ﴾ (الدخان: ۵۸)

پس اے نبی! اس کلام کو ہم نے آسان کرکے

تمھاری زبان میں اسی لیے نازل کیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

کی روشنی میں مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو زبان کی شرعی حیثیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے۔ اِس بنا پر اس کی حفاظت حسبِ استطاعت واجب ہے۔ اور باوجود قدرت کے اِس میں غفلت اور سستی کرنا معصیت اور موجبِ مواخذۂ آخرت ہوگی'' ۔(البلاغ:۲:۱۷)

اِسی طرح متعدد دوسرے کبار علما اور دینی و مذہبی رہ نماؤں نے بھی اردو زبان وادب کی اہمیت اور موجودہ عہد میں اس کی معنویت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے سیکھنے اور سکھانے کی تلقین کی ہے۔

اُردو کے بعض شعرا وادبا

ہر زبان کے فروغ اور ارتقا میں اُس کے شعرا وادبا کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ بلکہ اس زبان کی شناخت بھی اس کے شعرا وادبا سے ہوتی ہے۔ یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ دیکھی اور سنی جاتی ہے کہ اس زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے جو افکار وخیالات پیش کیے ہیں، متعلقہ زبان نے ان کا کس حد تک ساتھ دیا ہے یا اس کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زبان کو اپنے شعر و ادب میں کس سطح پر برتا ہے اور اس زبان کے قاری نے اس سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے کسی دوسری زبان کے مقابلے میں زیادہ تو ہوسکتے ہیں لیکن کم نہیں ہیں۔ جب ہم اِس پہلو سے انیسویں، بیسویں یا رواں صدی کے شعرا و ادبا کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں ایک اچھی تعداد ہمیں ان شاعروں اور ادیبوں کی ملتی ہے، جن کا تعلیمی پس منظر (Back Ground) صرف مدرسہ ہی رہا ہے۔ انھوں نے جو کچھ پڑھا یا سیکھا ہے، وہ کسی مدرسے ہی میں پڑھا یا سیکھا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے شعری یا نثری کارناموں کا اعتراف علم اور قلم دونوں سطحوں پر کیا گیا ہے۔ مثلاً: اردو میں حآلی اور شبلی کو بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا الطاف حسین حآلی

اردو میں نئی تنقید کا سہرا خواجہ الطاف حسین حآلی (۱۸۳۷-1915) ہی کے سر بندھتا ہے۔ گرچہ تنقید اور تبصرے کی روایت کسی نہ کسی درجے میں حآلی سے پہلے موجود تھی اور شعر وادب کے حسن وقبح اور فنی بلندی وپستی کے کچھ معیار قائم کیے گیے تھے۔ لیکن اسے ہم تنقید کی باقاعدہ اور منظم حیثیت نہیں دے سکتے۔ اس وقت جو کچھ تھا، وہ محض ذہنوں میں موجود تھا یا تذکروں، شاعروں کی غزلوں کے مقطعوں اور دواوین کے دیباچوں میں تھا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جنھیں تنقید کے آثار و نقوش سے تو تعبیر کیا جاسکتا ہے، لیکن انھیں تنقید نہیں کہا جاسکتا۔ حآلی پہلے وہ شخص ہیں، جنھوں نے مشرقی شعریات کے کچھ ایسے اصول اور معیار مقرر کیے، جنھیں اردو شاعری کے لیے سنگِ میل کی حیثیت دی گئی۔ ان کی کتاب ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کو علمی دنیا میں اردو تنقید کی پہلی کتاب کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے پوری تعلیم عربی مدرسے ہی میں حاصل کی

تھی۔ دلّی کے قدیم مدرسے، مدرسہ حسین بخش کو ان کی مادرِ علمی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گویا وہ بنیادی طور پر صرف مولوی تھے اور مولویت ہی ان کی شناخت تھی۔

علامہ شبلی نعمانی

اردو تنقید کے باب میں حالی کے بعد شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) کو بڑی اہمیت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اردو ادب کے بنیادی مسائل کو اجاگر کرنے میں شبلی پیش پیش رہے ہیں۔ وہ اردو کے اُن اہم فن کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں، جو بہ یک وقت شاعر و ادیب بھی ہیں اور ناقد، محقق، مورّخ اور انشا پرداز بھی۔ سرسید احمد خاں کے بعد حالی اور شبلی دو ایسے عظیم نام ہیں، جنھوں نے اردو کی نئی نثر کو پروان چڑھایا ہے۔ انھوں نے 'شعر العجم' اور 'موازنۂ انیس و دبیر' کے ذریعے تفہیمِ شعر کے جو اصول وضع کیے ہیں اور فنی سطح پر جو نظریات پیش کیے ہیں، اُنھیں شعر و نقد کی دنیا میں بڑا اعتبار حاصل ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کسی کالج یا یونی ورسٹی کے نہیں، صرف اور صرف مدرسے ہی کے پروردہ و پرداختہ تھے۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کا نام ان کے اہم اساتذہ میں آتا ہے۔ اُن کے تمام کارناموں کو مدرسوں ہی کے کھاتے میں ڈالا جائے گا۔

علامہ نیاز فتح پوری

علامہ نیاز فتح پوری (۱۸۸۴-۱۹۶۸) اُردو زبان و ادب کے اُن علما اور اربابِ قلم میں ہیں، جنھوں نے اردو زبان و ادب کی آب یاری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس کو بنانے اور سنوارنے میں وہ اپنے عہد کے شعرا و ادبا میں سب سے آگے رہے ہیں اور اس سلسلے کی تمام ناہم واریوں کو ختم کیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ میں 'نگار' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا، اس کے ذریعے سے انھوں نے اردو کی بنیادوں کو اجاگر کیا اور فنی و لسانی سطح پر اس کے نوک پلک درست کیے اور اردو زبان و ادب کے خلاف رچی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کر کے اس کی صحیح قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔ اپنے اِن کارناموں کی وجہ سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے اردو کے متعدد قد آور شعرا و ادبا کی رہ نمائی کی ہے۔ انھیں صحیح سمتِ سفر دکھائی ہے۔ نیاز فتح پوری نے فتح پور کے قدیم مدرسے مدرسہ اسلامیہ محلہ سید واڑہ میں تعلیم حاصل کی، وہیں سے وہ عالم ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کسی بھی کالج یا یونی ورسٹی میں داخلہ نہیں لیا۔ لیکن مختلف یونی ورسٹیوں اور دانش گاہوں میں وہ شاملِ نصاب ہیں۔ ان کے فن، شخصیت اور فنی و لسانی خدمات پر مقالے لکھے گیے ہیں۔ متعدد لوگوں نے اُن پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

رشید حسن خان

جناب رشید حسن خان (۱۹۳۰-۲۰۰۶) شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے شاہ جہاں پور کے مقامی مدرسے مدرسہ بحر العلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک تعلیم تو نہیں حاصل کر سکے۔ گھر کی مالی حالت خستہ ہونے کی وجہ سے نو یا دس برس کی عمر میں شاہ جہاں پور ہی کی کسی

فیکٹری میں نوکری کرلی تھی۔لیکن کم سنی میں انھوں نے جو کچھ پڑھ رکھا تھا، اپنی محنت اور مطالعے سے اُسے آگے بڑھایا۔ انھوں نے اردو زبان کو بنانے اور سنوارنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے املا پر کتابیں لکھیں، رموزِ اوقاف پر مقالے لکھے، محاورات اور روزمرّہ پر مباحث شائع کیے، صحیح زبان کیسے لکھی جاتی ہے اور اس کے کیا اصول وضوابط ہیں، اس سلسلے میں ان کی متعدد کتابیں موجود ہیں اور بڑے بڑے سمی ناروں میں اپنی فنی ولسانی معلومات کے جوہر دکھائے۔ ملک کی متعدد یونی ورسٹیوں میں انھوں نے اردو زبان وادب کے املا اور الفاظ کے صحیح و غلط استعمال پر لیکچر دیے، بے شمار تحقیقی مقالوں کے ممتحن رہے اور خود ان پر بھی تحقیقات ہوئیں اور ڈگریاں حاصل کی گئیں۔

رشید حسن خان نے اردو زبان کی آرائش وزیبائش اور اس کے فروغ اور ارتقا کے لیے جو کچھ کیا ہے، اُسے اردو زبان کی تاریخ میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے سارے کارناموں اور علمی ولسانی فتوحات کا سہرا مدرسوں کے سر بندھے گا۔

چند شعرا

ایسے شاعروں کی فہرست بہت طویل ہے، جو مدرسوں ہی میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ وہیں سے علومِ شرقیہ کی تعلیم حاصل کر کے انھوں نے اردو شعروسخن کے میدان میں قدم رکھا اور ہر سطح پر زبان وادب کے فروغ میں حصہ لیا اور اُسے مقبول و ہر دل عزیز بنایا۔ اختصار کا خیال رکھتے ہوئے ان سے میں چند شعرا کا تذکرہ ان کی زمانی ترتیب کے ساتھ کرنا چاہوں گا۔

علامہ شفیق جون پوری

فخرِ مشرق علامہ شفیق جون پوری (۱۹۰۲-۱۹۶۳) بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کے مقبول ترین شعرا اور اساتذۂ سخن میں تھے۔ وہ ۱۹۰۲ میں اپنے وطن جون پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بزرگ والد مولانا انیق چشتی صابری جون پوری سے حاصل کی۔ اپنی محترمہ خالہ اور خاندان کے ایک بزرگ حافظ جنید احمد صدیقی سے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد درسِ نظامی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ حنفیہ جون پور اور مدرسہ معینیہ اجمیر کا رُخ کیا۔ کچھ دنوں غازی پور میں بھی قیام رہا۔

شفیق جون پوری کو شعروسخن سے فطری دل چسپی تھی۔ آٹھ برس کی عمر میں شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ شروع میں امیر مینائی کے مشہور شاگرد اور اپنے ہم وطن حضرت حفیظ جون پوری سے اصلاح لی۔ ۱۹۱۶ میں ان کی وفات کے بعد حضرت نوح ناروی سے مشورۂ سخن کیا۔ نعت، مناقب اور تاریخ گوئی میں اپنے پدرِ بزرگ حضرت انیق جون پوری سے اصلاح لی۔ شعروسخن کی دنیا میں کافی حد تک شہرت حاصل کر لینے کے بعد مولانا حسرت موہانی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوگیے۔ مولانا حسرت موہانی نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ ان کے شاگردوں میں شفیق جون پوری جیسے باکمال شعرا شامل ہیں۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد کی

صلاحیت کا اعتراف کر کے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے کا نمبر نکالا ہو، اس کے جشن کا اہتمام کیا ہو اور اس کا کلام بھی مرتب کر کے شائع کیا ہو۔ شفیق جون پوری اُن خوش نصیب شعرا میں تھے کہ حسرت موہانی جیسے باکمال شاعر نے ان کا اعتراف کیا، اپنے رسالے 'اردوئے معلیٰ' کا شفیق جون پوری نمبر نکالا، ان کے جشن کا اہتمام کیا اور ان کا کلام بھی مرتب کر کے شائع کیا۔

شفیق جون پوری ایک قادرالکلام اور پُر گو شاعر بھی تھے اور منجھے ہوئے نثر نگار بھی۔ ان کی شاعری کے کم و بیش تیس (۳۰) مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں: بلبلِ چمن اول، بلبلِ چمن دوم، بلبلِ چمن سوم، خلدِ مسرت، تجلیاتِ طوبیٰ، شفق، صبحِ کعبہ، اخلاصِ مشرق، فانوس، بانگِ جرس، خرمن، خرمنِ عشق، سفینہ، نے، بینائے حجاز، ہشت جنت، دار السلام، شانہ، پھول اور چراغ، التاریخ الجمیل وغیرہ۔

اتنی ہی کتابیں نثر میں بھی ہیں، جن میں سے چند کے نام اس طرح ہیں: نظار الحسنین، سیف الابرار، تفسیرِ سورۂ الفجر، الفوز العظیم، بزرگوں کی باتیں، سعادتِ دارین، حیاتِ ادیبۃ النسا، خونِ حسن، کاشف الاسرار، احکام الاسلام فی حق الجاریہ، شفیق کے افسانے، انسانِ کامل، زندگی، سفرنامۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) توحید اور حاشیہ۔

شفیق جون پوری ایک اعلیٰ درجے کے ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ بہت کم عمری ہی سے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھنے لگے تھے۔ ۱۹۲۳ میں انھوں نے جون پور سے 'وحید العصر' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۳ تک وہیں سے ماہنامہ 'طارق' نکالا۔ ۱۹۳۳ میں مولانا حسرت موہانی کے رسالے 'اردوئے معلیٰ' کی مجلسِ ادارت میں شامل ہوئے اور اسی زمانے میں جناب ایوب احمد صبر شاہ جہاں پوری کے روز نامے 'مشیر' کان پور کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

شفیق جون پوری کے فن اور ان کی علمی و ادبی شخصیت پر ان کی زندگی ہی میں متعدد پروگرام ہوئے، ان کا جشن منایا گیا اور متعدد رسالوں کے ان پر خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ قومی رہ نماؤں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر سمپورنانند، خواجہ شمس الدین اور مذہبی رہ نماؤں میں مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مفتی عتیق الرحمٰن جیسے لوگوں نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور ایک درجن سے زائد ان پر کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں:

(۱) شفیق اینڈ ہز آرٹ (مرتبہ: عزیز ربانی اعزاز)
(۲) حیاتِ جاوداں (سیدہ جمیلہ سلطانہ)
(۳) ذکرِ شفیق (شمس الہدیٰ قیسی الفاروقی)
(۴) شفیق جون پوری فن اور شخصیت (ایس۔ایم۔عباس)
(۵) شفیق جون پوری - ایک مطالعہ (تابش مہدی)
(۶) شفیق جون پوری:

ہر لائف اینڈ پوئٹری (پروفیسر انور صدیقی)

ہندستان اور پاکستان میں شفیق جون پوری کے بے شمار شاگرد آج بھی موجود ہیں۔ شفیق جون پوری کسی نظریے یا تحریک کے دائرے میں رہ کر شاعری کرنے کے مخالف تھے۔ ان کے کلام میں آفاقیت ملتی ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

عنادل کو تو غم ہے، صرف اپنے آشیانے کا
یہاں سارا چمن موضوع ہے میرے فسانے کا
فقط ہندستان ہی تک نظر محدود ہو کیوں کر
خدا نے درد بخشا ہے مجھے سارے زمانے کا

انھوں نے یہ بھی کہا ہے:

ظرف جس کا ساتھ دے اتنی تمنا کیجیے
حسبِ استعداد فطرت سے تقاضا کیجیے
ظاہری آرایشوں سے پردہ پوشی تا کجا
کیوں نہ پہلے زندگی میں حسن پیدا کیجیے

ان کا نظریہ زندگی تھا کہ:

نئے زمانے کے رُخ پہ چلنا کسی طرح بھی نہیں گوارا
ذرا سنبھل کر قدم اٹھائے تو آدمی خود زمانہ گر ہے

انھوں نے اپنے اِن تین شعروں میں بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے:

تعجب ہے کہ پیرانِ حرم نے راستا بدلا
نظر بے گانۂ غرناطہ و بغداد ہے ساقی
دلوں سے ٹوٹتا جاتا ہے رشتہ تیری وحدت کا
چلیں نسل و وطن کی آندھیاں فریاد ہے ساقی
بلاتے ہیں بہت اپنی طرف غیروں کے بے خانے
بحمد اللہ کہ ہم کو اپنی منزل یاد ہے ساقی

شفیق جون پوری نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ پیغام بھی دیا ہے:

مجاہد کا وہ نعرہ ہو کہ دشت و کوہ تھرائے
مگر دشمن بھی زخمی ہو تو خیمے میں اٹھا لائے
یہ شانِ فتح و نصرت ہو کہ جب تلوار چمکائے
بڑھے آگے مگر لاشوں کو قدموں سے نہ ٹھکرائے
خود آگاہی و خود داری ، خود آرائی و خود فہمی
شفیق اتنے عناصر ہوں تو پھر انسان کہلائے

شفیق جون پوری اپنی عام زندگی کی طرح شعر و ادب میں بھی توازن اور تدریجی ارتقا کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں شاعری میں اعتدال و توازن کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کا کلام پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نہ وہ قدیم شعری و ادبی ذخیرے کا مذاق اڑانا پسند کرتے ہیں اور نہ انھیں جدید شعری و ادبی رجحانات سے نفرت ہے۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ جس طرح طبقۂ قدیم میں ہر ادیب و شاعر کسی خاص عظمت کا مستحق نہیں ہے، اسی طرح نئے ادب والوں میں بھی ہر شاعر یا ادیب کسی خاص امتیازی حیثیت کا حامل نہیں ہوسکتا۔ البتہ وہ طبقۂ قدیم و جدید کے درمیان یہ فرق ضرور محسوس کرتے ہیں کہ قدیم شعری دبستاں کا ہر سخن ور اربابِ نقد و تبصرہ اور اساتذۂ فن کے فیصلوں اور پرکھ کے بعد امتیازی نگاہ سے دیکھا گیا۔ جب کہ نئے دور کا شاعر اپنے

خاص ترنم ، اپنی مخصوص وجاہت، اپنے خاص اندازِ پیش کش ، کسی پارٹی کی حمایت، گروہ بندی اور صحافتی ناقدین کی تائید سے شہرت اور نام وری حاصل کرتا ہے۔ پھر اس کی یہ شہرت و ناموری اس درجے کو پہنچ جاتی ہے کہ اس کے اندر اربابِ نقد و فن، اساتذۂ سخن اور شعر وادب کی فنی قدروں سے بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔

شفیق جون پوری شعر وادب میں قومیت یا علاقائیت کے حامی نہیں ہیں۔ البتہ وہ اسلامی قومیت کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اسلامی قومیت میں خود بین الاقوامی عنصر موجود ہے اور اس کے تاریخی اشارات و تلمیحات ادب میں اس طرح مخلوط ہیں کہ ان کو ادب سے الگ کرنا ناخن کو گوشت سے الگ کرنے کے مترادف ہوگا۔

شفیق کے نزدیک شعر وادب میں الحاد کی آمیزش خود بین الاقوامی مزاج کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ بین الاقوامیت اس بات کا نام نہیں ہے کہ مشاعروں میں مندر، پجاری، گنگا، جمنا اور بنارس کی صبح پر نظمیں پڑھی جائیں اور اس طرح سے ملک کے اکثریتی طبقے کی خوش نودی حاصل کی جائے یا حب وطن کا دعوی کرنے کے باوجود روسی ادب کو کاندھے پر رکھ کر اشتراکیت اور خدا بیزاری کی اشاعت کی جائے۔

شفیق جون پوری گو کہ ایک قدیم وضع کے انسان تھے اور پوری زندگی انھوں نے قدیم تہذیب کو ہی ملحوظ رکھا، لیکن شعر وادب میں وہ جدید اسلوب اور تجربے برتنے کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہر شعبۂ زندگی میں تغیر وتبدل کا سلسلہ رہتا ہے تو شعر وادب کو کیوں اس سے محروم رکھا جائے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر وہ یہ رائے رکھتے تھے کہ ادب میں جدید وقدیم کی قید ادب کے لیے مہلک ہے۔

شفیق کی شاعری میں ہمیں قدیم وجدید کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے، جو اُن کے دوسرے ہم عصروں کے ہاں مفقود ہے۔ ان کے اشعار خواہ پسندیدہ ہوں خواہ ناپسندیدہ یا کسی قدر پست، ان میں سب سے بڑی خوبی اندازِ بیان کی جرأت ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں پوری جرأت کے ساتھ کہتے ہیں۔ شعر کے فنی ولسانی تقاضوں کا احترام ان کے ہاں بہ درجۂ اتم ملتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی رورعایت یا غفلت و مداہنت کو درست نہیں سمجھتے۔

شفیق جون پوری یوں تو جملہ اصناف پر قادر تھے لیکن ان کے ہاں غزل کا رجحان غالب ہے۔ قومی وملی نظمیں بھی ان کے ہاں اپنی پوری فنی توانائی کے ساتھ ملتی ہیں۔ غزل گوئی میں وہ حسرت موہانی کے جانشیں ہیں اور نظم نگاری میں حالی، شبلی اور اقبال سے وہ قریب نظر آتے ہیں۔ اور دوسری اصناف نعت و مناقب، قصائد، مراثی، قطعات اور تاریخ گوئی میں وہ اپنے والدِ محترم حضرت انیق جون پوری کے پیرو اور مقلد ہیں، جو اپنے عہد میں یادگارِ داغ کے طور پر جانے جاتے تھے۔

نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کریں:

منزلِ خاص کہیں ، رہ گزرِ عام کہیں
بے دلوں کو نہ ملا گوشۂ آرام کہیں

مسکراتا ہے کوئی پھول تو جی ڈرتا ہے
ڈھونڈتی ہو نہ اُسے گردشِ ایام کہیں

ابھی کیا عمر ہے میری وفا کی
درازی چاہیے زلفِ دوتا کی
کلی مرجھا گئی مرضی خدا کی
بہت رو رو کے شبنم نے دعا کی

وہ صاحبانِ ہوش و خرد کو کہاں نصیب
جو آگہی کی شان ترے بے خبر میں ہے

گریۂ شوق کی لذت ، غمِ پنہاں کے مزے
ہائے وہ کوچۂ محبوب میں تنہا ہونا

دامن سے بھی نہ تم نے لپٹنے دیا کبھی
ہم نے اسی امید میں مٹی خراب کی

ذوقِ نمود حسن کی فطرت سہی مگر
نظریں ہوں ناشناس تو پردہ بھی چاہیے

تمھیں کیوں داستانِ غم سنادی
تمھاری آہ نے بجلی گرادی

یہ کہہ کے ہوئی نکہتِ گل باغ سے رخصت
جاتی ہوں مگر بے وطنی یاد رہے گی
سایے میں کہیں بیٹھ کے خود پاؤں دبانا
یا رب ! وہ غریب الوطنی یاد رہے گی

کسی در پہ سر جھکائے یہ شفیق کہہ رہا تھا
مری خو رضا پسندی، تری بے رخی کی عادت
شفیق اس کے کرم کا ایک چھینٹا بھی جو پڑ جائے
ہمارا دامنِ تر دامنِ احرام ہوجائے

یہ تو ان کی غزلوں کا رنگ ہے ۔جب ہم ان کی نظمیں پڑھتے ہیں تو وہی کیف ولذت وہاں بھی ہے، جو ان غزلیہ اشعار میں ہے۔ بلاشبہہ شفیق جون پوری کی شاعری نے اردو زبان کو سنوارا ہے، اُسے دور دور تک پہنچایا ہے اور اس کے ادب میں ایک ایسا قیمتی اضافہ کیا ہے، جو تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ یہی کام ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ بھی انجام دے رہے ہیں۔

فیض احمد فیض

میں نے شعرا یا ادبا کی ترتیب کے لیے ان کی پیدائش کی تاریخوں کو بنیاد بنایا ہے۔ یہی رویہ میں نے اپنی کتابوں 'اردو تنقید کا سفر'، 'نقدِ غزل' اور 'تنقید و ترسیل' میں بھی اپنایا ہے۔ اس کے اعتبار سے یہاں شفیق جون پوری کے بعد فیض (۱۹۱۱-۱۹۸۴) کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کی بھی تعلیم و تربیت مدرسے ہی میں ہوئی تھی۔ انھوں نے مشہور

اہلِ حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کے مدرسے میں ۱۹۱۵ میں حفظِ قرآنِ مجید کیا تھا۔ وہیں سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ کالج کی طرف انھوں نے بعد میں رخ کیا اور اِسی تعلیم کی بنیاد پر وہاں انھوں نے ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ فیضؔ بیسویں صدی عیسوی کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ اِس وقت ہر جگہ ان کی ہی دھوم ہے۔ ان کی یادیں منائی جارہی ہیں۔ ان پر سیمینار ہورہے ہیں اور رسائل و جرائد کے خصوصی شمارے بھی شائع ہورہے ہیں۔ درحقیقت ان کا سارا شعری کام مدرسوں ہی کے کھاتے میں آتا ہے۔ انھوں نے اپنے مختلف انٹرویوز اور بیانات میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن چوں کہ میں نے بہ وجوہ ہندستانی شعرا کو ہی موضوعِ گفتگو بنایا ہے، اس لیے ان کی شاعری پر تجزیاتی گفتگو نہیں کررہا ہوں۔ صرف ان شعرا کو ہی اِس مختصر فہرست میں رکھا ہے، جن کا تعلق منقسم ہندستان سے ہے۔ جنھوں نے ہندستان کو ہی اپنا دائرۂ عمل بنایا، آخر عمر تک یہیں رہے اور یہیں کی مٹی میں دفن ہوئے۔

مجروحؔ سلطان پوری

جناب اسرار حسن خاں معروف بہ مجروحؔ سلطان پوری (۱۹۱۵-۲۰۰۰) ہمارے عہد کے ممتاز غزل گویوں میں ہیں۔ اردو دنیا میں جب بھی ان شعرا کی فہرست مرتب ہوگی، جنھوں نے غزل کو اپنی محبوبۂ سخن کے طور پر اپنی زندگی میں شامل کیا، غزل کی کلاسیکی روایات کی پاسداری کی اور غزل ہی کے لیے پوری اردو دنیا میں وہ جانے اور پہچانے گیے تو جناب مجروحؔ سلطان پوری کو نظر انداز نہ کیا جاسکے گا۔

مجروحؔ سلطان پوری ۱۹۱۵ یا ۱۹۱۶ میں یوپی کے ضلع سلطان پور کی ایک غیر معروف بستی گجہڑی میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۸۵ میں جب میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں پاکستان گیا تو کراچی کے بعض ہم وطن عزیزوں سے بھی ملنے کا پروگرام بنایا۔ وہاں کراچی کے لانڈھی علاقے میں ضلع پرتاپ گڑھ اور ضلع سلطان پور سے پیدائشی تعلق رکھنے والے باشندوں نے انجمن باشندگانِ پرتاپ گڑھ اور انجمن باشندگانِ سلطان پور کے نام سے اپنی اپنی انجمنیں بنا رکھی ہیں۔ یہ انجمنیں بہت وسیع پیمانے پر خدمتِ دین وملت انجام دے رہی ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی بلڈنگیں ہیں، ایمبولنس اور ہسپتال بھی ہیں، اسکول اور مکاتب بھی ہیں اور بھی بہت سے کام ہیں، جو وہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ یہ انجمنیں ہندستان سے جانے والے اہلِ علم، شعرا اور ادبا کا استقبال بھی کرتی ہیں۔ جس زمانے میں میں گیا تھا، اسی زمانے میں جناب مجروحؔ سلطان پوری بھی کسی دوسرے پروگرام میں شرکت کے لیے گیے ہوئے تھے۔ چنانچہ انجمن سلطان پور نے انھیں اعزاز دیا اور انجمن پرتاپ گڑھ نے مجھے نوازا۔ پھر دونوں نے مل کر دونوں کو ایک ساتھ اعزاز سے سرفراز کیا۔ اس موقعے پر مجروحؔ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور ان سے گفتگو کا موقع میسر رہا۔ ان کے بارے میں یہ بات تو مجھے بہت پہلے سے معلوم تھی کہ ان کا تعلیمی بیک گراؤنڈ مدرسہ رہا ہے۔ میرے استادِ محترم مولانا محمد ایوب صدیقی بھی بتاتے تھے کہ مجروحؔ سلطان پوری ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے مدرسے مدرسہ کنز العلوم

میں ان کے ہم زمانہ رہے ہیں اور فطرتاً بڑے شوخ اور تیز رہے ہیں۔ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کا مستقل سلسلہ رہتا تھا۔ لیکن انھوں نے کس منزل تک پہنچ کر اور کیوں مدرسہ چھوڑا، اس کی صحیح تفصیل مجروؔح صاحب سے معلوم ہوئی۔ مجروؔح سلطان پوری کی پوری تعلیم درسِ نظامی کے نصاب کے تحت مدرسے ہی میں ہوئی تھی۔ بس چند مہینے باقی رہ گیے تھے کہ ان کی کسی شرارت پر مدرسے سے ان کا اخراج ہوگیا اور وہ مستند مولوی ہونے سے رہ گیے۔ لیکن سند سے کیا ہوتا ہے، علمی طور پر وہ مولوی ہی تھے۔ کنز العلوم ٹانڈہ سے نکلنے کے بعد انھوں نے کسی بھی اسکول یا کالج میں داخلہ نہیں لیا۔ لکھنؤ میں شفاء الملک حکیم عبدالمعید صاحب کی صحبت میں رہ کر طب کی تعلیم حاصل کی۔ پھر کچھ دنوں ٹانڈے ہی میں اپنی مادرِ علمی سے قریب اپنا شفاخانہ کھولا اور مطب کرتے رہے۔ ہمارے فارسی کے استاذ مولانا حسن مجتبیٰ صاحب کے برادرِ بزرگ حکیم ابن صاحب سے ان کا بڑا دوستانہ تھا۔ حکیم صاحب کا مکان یوں بھی شعراو ادبا کا مرکز تھا۔ حضرت شفیقؔ جون پوری اور دوسرے شعرا بھی وہیں قیام کرتے تھے۔ حکیم ابن صاحب نے مجروؔح پر بڑا تفصیلی مضمون بھی لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے مجروؔح صاحب کی جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کی داستان بھی دہرائی تھی اور ان کے عشق و محبت کے قصے بھی بیان کیے تھے اور ان کے شاعرانہ مقام پر بھی گفتگو کی تھی۔

مجروؔح سلطان پوری مدرسے کے ماحول سے اتنے برگشتہ ہوگیے تھے کہ انھوں نے بڑی حد تک دین ہی سے لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ اسی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی سے بھی وابستہ ہوگیے تھے۔ اشتراکیت کے بڑے حامیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کا یہ شعر ان کے اسی رویے کا ترجمان ہے:

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروؔح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

لیکن بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے آخری لمحات میں اپنی اس روش پر پشیمانی ظاہر کی تھی اور وہ ایک سچے اور پکے مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا عزم کرچکے تھے کہ اوپر سے طلبی ہوگئی۔ سچ کہا ہے کسی نے:

انساں کو چاہیے کہ خیالِ قضا رہے
ہم کیا رہیں گے جب نہ رسولِ خدا رہے

مجروؔح سلطان پوری نے عمر کا بڑا حصہ فلمی دنیا میں گزارا۔ نہ جانے کتنی فلموں کے لیے گیت اور گانے لکھے اور نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی لیکن وہ غزل اور اس کی قدروں سے کبھی لاتعلق نہیں رہے۔ ان کے یہ اشعار آج بھی اہلِ ذوق کی زبانوں پر رہتے ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گیے اور کارواں بنتا گیا

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گیے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا، کہ چراغ راہ میں جل گیے

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے
شبِ انتظار کی کش مکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا، کبھی اک چراغ بجھا دیا

مولانا عامر عثمانی

اردو زبان وادب کے ارتقا اور مدارس کے سلسلے کی جب بھی کوئی گفتگو ہوگی ، اُس میں مولانا عامر عثمانی (۱۹۲۰-۱۹۷۵) کو نہیں نظر انداز کیا جاسکے گا۔ مولانا عامر عثمانی نے شاعری اور نثر میں جو اہم علمی ، ادبی اور تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں، وہ پوری اردو دنیا کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ وہ دیوبند کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ دار العلوم دیوبند میں ابتدا سے لے کر آخر تک تعلیم حاصل کی اور وہیں نومبر ۱۹۳۹ میں ''تجلی'' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جو علمی و مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی اور تنقیدی رسالہ بھی شمار کیا جاتا تھا۔ ماہ نامہ 'تجلی' کے ادبی تبصرے، اس کا خاص مزاحی کالم 'مسجد سے مے خانے تک' اور اس میں ہر ماہ شائع ہونے والی مولانا عامر عثمانی اور دوسرے شعرا کی منتخب غزلیں یہ سب چیزیں اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکی ہیں۔ متعدد یونیورسٹیوں میں ان کی علمی و ادبی خدمات پر ریسرچ ہو چکے ہیں۔ وہ شاعری میں رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ ان کی غزلیں بھی انھی کے رنگ میں ہوتی تھیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'یہ قدم قدم بلائیں' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہاں چند شعر بہ طور نمونہ ملاحظہ کریں:

نہ سکت ہے ضبطِ غم کی ، نہ مجالِ اشک باری
یہ عجیب کیفیت ہے ، نہ سکوں نہ بے قراری
ترا ایک ہی ستم ہے ، ترے ہر کرم پہ بھاری
غمِ زندگی سے دے دی مجھے تو نے رست گاری
مجھے لے چلا بہا کر ، غمِ زندگی کا دھارا
غمِ عشق یاوری کر ، ہے مجالِ شرم ساری
وہ نگاہ یاد آئی ، مجھے تھامنا ، چلا میں
یہ پڑے ہیں جام و ساغر، یہ دھری ہے بادہ خواری
یہ قدم قدم بلائیں ، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے ، جسے زندگی ہو پیاری

دولت کی پوجا کو دنیا زیست کا حاصل ٹھہراتی ہے
لیکن میں سو بار کہوں گا زہرِ ہلاہل ، زہرِ ہلاہل
میری تازہ لاش پہ عامر دنیا نے جب شور مچایا
وہ اک سمت اشارہ کر کے خود بھی چیخے قاتل قاتل

مولانا عامر عثمانی 'تجلی' کی بے پناہ قلمی مصروفیات کے باوجود کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شائقین کے اصرار پر چلے جاتے تھے اور جہاں جاتے تھے، ان کے کلام کی دھوم مچ جاتی تھی۔ بڑے بڑے مترنم اور مشاعروں کو لوٹنے والے شعرا ان کے سامنے پھیکے پڑ جاتے تھے۔ ان کا انتقال بھی اتفاقاً ۱۲ر

اپریل ۱۹۷۵ کو پونا کے ایک مشاعرے میں اسٹیج ہی پر کلام سنانے کے فوراً بعد ہوا۔

فضا ابن فیضی

فضا ابن فیضی (۱۹۲۳-۲۰۰۹) کا نام اردو دنیا کا ایک نمایاں نام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف ہندستان نہیں، عالمی سطح پر جب بھی اردو زبان وادب کے خدمت گزاروں کا تذکرہ لکھا جائے گا، اس میں حضرت فضا ابن فیضی کا نام ضرور شامل ہوگا۔ حضرت فضا ابن فیضی یوپی کے صنعتی شہر مئوناتھ بھنجن میں وہاں کے ایک خالص علمی اور مذہبی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ مئوناتھ بھنجن کے دو مشہور مدرسوں مدرسہ فیضِ عام اور مدرسہ عالیہ میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ عالمیت اور فضیلت کی سند حاصل کرنے کے بعد مئو ہی میں اپنے خاندانی پیشے میں لگ گیے۔ چونکہ شعر گوئی کا ذوق انھیں ورثے میں ملا تھا، اس لیے بہت کم عمری ہی سے شعر گوئی کرنے لگے۔ ماحول کچھ ایسا ملا تھا کہ انھیں کسی ایک استاد کا دامن پکڑنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ متعدد تدریسی اساتذہ سے مشورۂ سخن کا سلسلہ رہا اور بس۔

فضا ابن فیضی ہمارے ان شعرا میں ہیں، جنھیں کثیر الاشاعت خیال کیا جاتا رہا ہے۔ ہندستان یا پاکستان کا کوئی بھی ادبی رسالہ اٹھائیے، اس میں فضا ابن فیضی اپنی کسی تخلیق غزل، نظم یا قطعات ورباعیات کے ساتھ موجود ملتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اب سے تقریباً چالیس برس پہلے ماہ نامہ 'شمع' دہلی میں ایک سوال آیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس وقت اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ اس وقت سب سے بڑا شاعر کثرتِ آرا کی بنیاد پر حضرت فضا ابن فیضی ہی کو قرار دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ آرا رسائل وجرائد میں ان کی تخلیقات کی کثرت سے اشاعت ہی کی وجہ سے بنی ہوں گی۔ ورنہ وہ تو بس گوشہ نشیں آدمی تھے۔ مشاعروں میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے اور نہ انھیں شہرت و نام وری حاصل کرنے کا فن آتا تھا۔ لیکن اِس گم نامی اور گوشہ نشینی کے باوجود اہلِ علم وادب نے ان کی قدر کو پہچانا۔ رسائل نے ان پر نمبر شائع کیے۔ مالیگاؤں کے 'توازن' نے دو جلدوں میں ان پر اپنا نمبر شائع کیا۔ ان کے فن اور شاعری کو موضوع بنا کر مقالے لکھے گیے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی گئیں۔

فضا ابن فیضی یوں تو جملہ اصناف میں شعر گوئی فرماتے تھے۔ لیکن غزل سے انھیں خصوصی مناسبت تھی۔ غزل میں بھی انھیں غالبؔ سے خاص شغف تھا۔ بلکہ ایک طرح سے انھیں پیروِ غالبؔ کہا جاسکتا ہے۔ اپنے تلامذہ اور وابستگان کو بھی غالبؔ کو پڑھنے اور غالبؔ کا رنگِ سخن اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ انھوں نے اپنی مختلف غزلوں میں غالبؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

غالبؔ کے فکر وفن کا وہ اسلوبِ دل نواز
اس کو فضاؔ جدید غزل کا امام لکھ

تو ہے غالبؔ کے لیے شیفتہؔ سا
منتخب شعر ہوں دیوان میں رکھ

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

غالبؔ سے کم نہ کوئی سخن ور ملا ہمیں
اک عہد ساز طرزِ سخن چاہیے ہمیں
غالبؔ سی کج کلاہی فن چاہیے ہمیں

نمونے کے طور پر ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

بس دوم قدم ہے حرف و قلم سے صلیب تک
یہ فاصلہ بھی تیری سیاست مٹا نہ دے
صلیبیں ساتھ رہیں پھر بھی حرفِ حق میں نے
کنایۃً بھی کہے اور برملا بھی کہے
میں کوئی برف نہیں ہوں کہ پگھل جاؤں گا
واسطہ وقت کے سورج کو پڑا ہے مجھ سے
ملنا اگر ہے مجھ سے تو تیشہ بہ دست آ
میں پتھروں کے شہر میں ہیرے کی کان ہوں
نہ رکھو جسم کے زنداں میں اس کو
لہو ہے روشنی کا نام لوگو !
ویسے تو میں بھی کوئی پیمبر نہ تھا مگر
رکھا جو بڑھ کے پاؤں تو دریا سمٹ گیا

حضرت فضا ابن فیضی نے کم و بیش ستر برس اردو زبان وادب کے گیسو سنوارے، درجنوں نوجوانوں کو اپنے فیضِ تربیت سے صفِ اول کے شعرا میں کھڑا کیا۔ ان کے شعری مجموعے سفینۂ زرنگل، شعلہ، نیم سوز، دریچۂ سم سمن، پسِ دیوارِ حرف، معنی حرف بے گانہ اور سرشاخِ طوبیٰ آج بھی شعر وادب کا صحیح ذوق رکھنے والوں کی آنکھوں کا سرمہ بنے ہوئے ہیں۔

کیفی اعظمی

کیفی اعظمی (۱۹۲۵-۲۰۰۲) کا نام ایک فلمی اور اشتراکی شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے کم و بیش ساٹھ برس شاعری کی اور اس کا بڑا حصہ انھوں نے فلم انڈسٹری سے وابستگی میں گزارا۔ اپنی عام زندگی میں بھی وہ ایک آزادانہ فکر کے حامل رہے ہیں۔ دین و مذہب سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تھے تو شیعہ اور ان کے خاندان میں بھی لوگ شیعہ مذہب پر ہی کاربند تھے اور تمام شیعی روایات کی پاس داری کرتے تھے، لیکن کیفی اعظمی کو اشتراکیت سے ان کی وابستگی نے تمام مذہبی قدروں سے بے گانہ کر رکھا تھا۔ ان کی بیٹی شبانہ اعظمی بھی فلم انڈسٹری سے وابستہ اور ایک آزاد خیال خاتون ہیں۔

جناب کیفی اعظمی نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے گھر کے مذہبی ماحول میں حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے والدِ بزرگ نے ان کا داخلہ لکھنؤ کے مشہور شیعہ تعلیمی ادارے مدرسہ سلطان المدارس میں کرادیا۔ وہاں سے انھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اتر پردیش کے عربی و فارسی بورڈ سے انھوں نے فارسی میں منشی اور کامل کے امتحانات پاس کیے اور عربی میں اعلیٰ نمبروں کے ساتھ انھوں نے مولوی اور عالم کے امتحانات میں کام یابی حاصل کی۔ گویا ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ کیفی اعظمی بنیادی طور پر ایک مولوی تھے اور انھوں نے اردو زبان وادب کے لیے جو کچھ بھی کیا، وہ مدارسِ عربیہ کے ہی خانے میں آتا ہے۔

کیفی اعظمی نے بہت کم عمری میں شعر گوئی شروع

کردی تھی۔ان کی پہلی غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجا نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکرِ نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہ ہر حال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غمِ تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کی نام پہ جس کے اُبل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
میں خوش تو ہوگیا مگر آنسو نکل پڑے

کیفی اعظمی ادب میں نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے اِس رویے سے اتفاق بھی کیا جاسکتا ہے اور اختلاف بھی۔لیکن تحریک کے مقاصد کو پھیلانے اور وسعت دینے کی جو مسلسل کوشش ہمیں کیفی اعظمی کی زندگی میں ملتی ہے، وہ بہ ہر حال لائقِ تقلید ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے انسان دوستی، مساوات اور مظلوموں کے ساتھ ہم دردی وغم گساری کا جو پیغام مؤثر اور دل نشیں انداز میں پیش کیا، وہ بہ ہر حال قابلِ تحسین ہے۔اسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کے اِس رویے سے پہلو تہی کرنا حقیقت شناسی کے منافی ہے۔

خلاصۂ کلام

میں نے قلتِ وقت اور حکمِ اختصار کے پیشِ نظر اردو کے ان چند شعرا اور ادبا پر گفتگو کی ہے، بلکہ ان کی نشان دہی کی ہے، جو اپنی نظم ونثر اور فنی ولسانی خدمات کے لیے پوری اردو دنیا میں مشہور ہیں۔ان کے کارناموں کا ہر طبقے میں اعتراف کیا گیا ہے اور انھوں نے جو کچھ کیا ہے، اُسے درجۂ استناد حاصل ہے اور یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے جو کچھ بھی پڑھا یا سیکھا ہے، وہ عربی مدرسوں ہی میں پڑھا یا سیکھا ہے اور ان کا سارا مبلغِ علم مدارسِ عربیہ کی چہار دیواریوں ہی کا مرہونِ منت ہے۔اگر ہم ان شعرا و ادبا کے نام گنوانے لگ جائیں جو شہرت تو کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے حوالے سے رکھتے ہیں، لیکن ان کی بنیادی تعلیم مدارسِ عربیہ یا مکاتبِ اسلامیہ ہی میں ہوئی ہے تو فہرست بہت لمبی ہوجائے گی۔ان سب پر گفتگو کے لیے دفتر درکار ہے۔نہ پوچھیے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب مدرسوں اور مکتبوں میں پروان چڑھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی آب یاری ہمیشہ مدارسِ عربیہ اور مکاتبِ اسلامیہ ہی میں ہوئی ہے۔اِس وقت ہندستان میں اردو زبان صرف اور صرف مدرسوں اور مکتبوں ہی سے توانائی حاصل کررہی ہے۔اگر خدانخواستہ مدارس و مکاتب کو ختم کرنے کی سازش کام یاب ہوگئی تو اردو زبان سسک سسک اور بلک بلک کر دم توڑ دے گی۔اردو زبان و ادب کی بقا کے لیے مدارسِ عربیہ اور مکاتبِ اسلامیہ کی حفاظت ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

نظم

گلنار آفریں

(کوئی لکھ رہا ہے خوں سے، میرے عہد کا فسانہ)

وہ محبتوں کی دنیا کہ جو خراب ہوگئی ہے
جو متاعِ زندگی تھی وہی ہم سے کھو گئی ہے

وہ یہیں کہیں پہ ہوگی انھی بام و در میں ہوگی
چلو آؤ ڈھونڈ لائیں وہ اسی نگر میں ہوگی

یہی سرزمیں تھی میری یہی آسماں تھا میرا
جو لُٹا رہا تھا خوش بو یہی گلستاں تھا میرا

یہاں رنجشیں نہیں تھیں، یہاں سازشیں نہیں تھیں
یوں قدم قدم پہ بکھری کہیں نفرتیں نہیں تھیں

نہ تھی آدمی کی عظمت کبھی خاک وخوں میں غلطاں
نہ ہوا تھا زندگی کا کبھی یوں وقار ارزاں

نہ اُداس ہی تھے چہرے، نہ تھیں مضطرب نگاہیں
نہ تھیں مضمحل فضائیں، نہ تھیں خونچکاں ہوائیں

یہ تباہیوں کا عالم ، یہ ہلاکتیں مسلسل
یہی روز وشب کے جھگڑے، یہ قباحتیں یہ ہلچل

یہ ستم کی وارداتیں، یہ عداوتیں کہاں تک
یہ الم کے تازیانے ، یہ حقارتیں کہاں تک

یہ دل ونظر کی پستی ، یہ ہوس کی حکم رانی
یہ قدم قدم پہ سودے ، یہ ہے آج کی کہانی

نہ اَنا کا کوئی گھر ہے ، نہ ہے ذات کا ٹھکانہ
کوئی لکھ رہا ہے خوں سے، میرے عہد کا فسانہ

رہِ زندگی میں آکر ، کبھی ہوسکو تو دیکھو
یہ فریبِ زندگی ہے ، جو سمجھ سکو تو سمجھو

جہاں زندگی ہو رقصاں، مجھے وہ مکان دے دو
مجھے وہ زمین دے دو ، وہی آسمان دے دو

جو لُٹا رہا تھا خوش بو ، وہی گلستان دے دو
یہ صدائے زندگی ہے ، مجھے اب امان دے دو

غزل

عزیزؔ بگھروی

انس وعداوت، رنج ومسرت، جینا مرنا تیرے نام
سوچ رہاں ہوں جانِ تمنا لکھوں کیا کیا تیرے نام

سنگِ ستم سے، دار ورسن سے، اس کی ہم کو داد ملی
ہم نے جو منسوب کیا تھا شعرِ غزل کا تیرے نام

دُنیا بھر کے طوفانوں کا ہم نے دَم خَم دیکھ لیا
روشن کر کے ایک چراغِ حسنِ تمنا تیرے نام

اُٹھتے ہیں تو اُٹھیں طوفاں، گرتی ہے تو برق گرے
بستی بستی ہم بھی کریں گے محفل برپا تیرے نام

تیغِ ہوس بھی ٹوٹ چکی ہے، سحرِ جفا بھی ختم ہوا
آنے والا رنگِ زمانہ، مختص ہوگا تیرے نام

حیف! یہ اس دُنیا کی قدریں، اُف یہ لوگوں کا معیار
میٹھا میٹھا سارا اپنا، کڑوا کڑوا تیرے نام

میں اک شاعر میں کیا جانوں رسم و راہِ عشق عزیزؔ
دل کی اُمنگیں تیرے صدقے، سر کا سودا تیرے نام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆
☆☆

غزل

حکیم افتخار فخر

لہو دل کا ابھی تک میرے دامن پر نہیں آیا
بدن میں قید جو لاوا ہے وہ باہر نہیں آیا

مرے احباب نے شاید بدل دی ہے روش اپنی
بہت دن سے مرے گھر میں کوئی پتھر نہیں آیا

محبت کا ابھی آغاز ہے غم سے ہو بیگانے
تمھارے سامنے منظر ہے پس منظر نہیں آیا

نہ جانے کیوں مرا صیاد مجھ سے اتنا برہم ہے
نیا تو ایک بھی بازو میں میرے پر نہیں آیا

سفر نے اس قدر دھندلا دیے آنکھوں کے آئینے
کھڑے ہیں گھر کے آگے کہہ رہے ہیں گھر نہیں آیا

مٹا دے ساری دنیا سے جو صدیوں کی برائی کو
ابھی وہ انقلاب انسان کے اندر نہیں آیا

بھرم تشنہ لبی کا ہم سے بڑھ کر کون رکھے گا
بلا کی پیاس تھی اور ہاتھ میں ساغر نہیں آیا

مواقع اشتعال انگیزیوں کے فخر کافی تھے
ہمارے ہاتھ میں لیکن کبھی خنجر نہیں آیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

غزل

عرشی بھوپالی

تختۂ دار محبت کی سزا ٹھہری ہے
جان لینا مرے قاتل کی ادا ٹھہری ہے

ساتھیو کب مرے گلشن کی کھلیں گی کلیاں
کچھ بتاؤ تو کہاں بادِ صبا ٹھہری ہے

راہ دشوار ، سحر دور ، گھنی شب لیکن
قافلے ٹھہرے نہ قدموں کی صدا ٹھہری ہے

رنگ گل کا ہے سلیقہ ، نہ بہاروں کا شعور
ہائے کن ہاتھوں میں تقدیرِ حنا ٹھہری ہے

میکشو ٹوٹ پڑو ، چھین لو ساقی سے ایاغ
کب سے میخانے پہ رنگین گھٹا ٹھہری ہے

رازِ صیّاد کیا سارے چمن نے افشا
کیا قیامت ہے کہ بلبل کی خطا ٹھہری ہے

کتنے جانباز ہیں حق گوئی کے مجرم لیکن
قابل دار فقط تیری ادا ٹھہری ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

افسانہ

''یہاں اور وہاں''

(اسلامی افسانہ)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

''بیٹے ۔۔۔اک بار میری بات مان لے، کام یاب رہے گا۔ میرے چار بیٹوں میں تو سب سے زیادہ ضدی ہے۔ضدی آدمی اکثر پریشان رہتا ہے۔اب کی بار یہ تیرا تیرہواں انٹرویو ہے۔ یہ رشی، منیوں اور پیغمبروں کا زمانہ نہیں ہے، بلکہ آج کل کے دور میں تو ہر چیز اور ہر معاملہ بازاری ہوگیا ہے۔تو کئی برسوں سے اپنی ذہانت، محنت، صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر اپنا مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن ہر بار رشوت اور سفارش سے نالائق قسم کے لوگ اونچے عہدوں پہ فائز ہوجاتے ہیں، لہذا اس بار میری بات مان لے''۔

عادل کے ماتھے پہ اپنے باپ قمرالدین کی باتیں سن کر شکنیں سی ابھر آئیں۔باپ کے ادب واحترام کا خیال رکھتے ہوئے وہ بولا'' پاپا۔۔۔کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ رشوت دینے اور لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ مجھے اللہ پہ کامل بھروسہ ہے کہ ایک دن ضرور مجھے میرا حق اللہ دلا دے گا کیونکہ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں''۔

قمرالدین اپنے بیٹے کی باتیں سن کر رنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ پشیمان بھی ہوئے۔ان سے چپ نہیں رہا گیا۔ کہنے لگے'' ارے بیٹے ! اس طرح تجھے سرکاری نوکری ملنے سے رہی۔ تیری شادی کی عمر نکلتی جارہی ہے اور تو عجیب قسم کی امید لگائے بیٹھا ہے۔ میں تیری سرکاری ملازمت کے لیے بینک سے سات لاکھ روپے قرض لے سکتا ہوں۔مگر تو روپے دے کر ملازمت خریدنے کے لیے تیار تو ہو''۔

''پاپا۔۔۔بالکل نہیں، میں کسی بھی صورت میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں''۔

عادل یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔اس کے دوست باہر کھڑے اس کا انتظار کررہے تھے۔وہ ہر روز چار بجے کے بعد ان کے ساتھ شہر کے اسٹیڈیم میں کھیلنے جاتا تھا۔ وہ نہایت ذہین اور محنتی تھا۔انفارمیشن ٹکنالوجی میں پی ایچ ڈی کے علاوہ نیٹ اور جے آر ایف کے امتحانات پاس کرچکا تھا۔دس کتابوں کا مصنف تھا۔امریکہ اور جرمنی میں

اس کی کتابوں پہ ریسرچ ہورہی تھی۔ متوسط گھرانے سے اس کا تعلق تھا۔ عادل کا باپ قمرالدین ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے رٹائر ہوچکے تھے۔ عادل کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ تینوں بھائی سرکاری ملازم تھے اور بہنیں گریجویشن کرچکی تھیں۔ عادل ملازمت کے لیے پریشان تھا اور اس کے ابا اس سے اس بات پہ نالاں تھے کہ وہ وقت اور حالات کی نبض نہیں پہچانتا ہے۔ اب کی بار اس نے پھر ایک یونیورسٹی کے شعبۂ انفارمیشن ٹکنالوجی میں اسسٹینٹ پروفیسر کی پوسٹ کے لیے فارم بھرا تھا۔ انٹرویو کارڈ گھر میں آچکا تھا۔ اس میں ضروری ہدایات کے علاوہ ۷ر فروری ۲۰۱۳، وقت ۱۰ بجے صبح، بمقام نارائن ریسٹ ہاؤس، اڑیسہ درج تھا۔ عادل دن دوگنی، رات چوگنی محنت کررہا تھا۔ انٹرویو سے دو دن پہلے اس کے دل و دماغ پہ محنت، مقدر اور رشوت کی عجیب کش مکش سوار ہوئی۔ انسان کو ڈھنگ، طریقے اور اصول وضوابط کے مطابق جینا آجائے تو زندگی ایک سہانا سفر بن جاتی ہے اور جب فطری ضابطوں کی پروانہ کرتے ہوئے انسان دنیا میں جیتا ہے تو پریشان رہتا ہے۔ عادل اصول پرست تھا۔ وقتی طور پر اگرچہ وہ سرکاری ملازمت کے لیے پریشان تھا لیکن اس کا دل بہت حد تک مطمئن بھی تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ عیاری، مکاری، غداری اور فریب کاری کی عمر لمبی نہیں ہوتی ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جس یونیورسٹی میں وہ اسسٹنٹ پروفیسری کا انٹرویو دینے جارہا ہے، اس یونیورسٹی کا شیخ الجامعہ نہایت ایمان دار، نیک سیرت، خوش اخلاق اور عدل و انصاف کا مالک ہے۔ عادل نے اپنے تمام تعلیمی دستاویزات، اپنی تصانیف، انعامات واعزازات کی ایک طویل فہرست کو ترتیب سے رکھا اور دوسرے دن انٹرویو دینے چلا گیا۔

امیدواروں کی ایک خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔ سبجیکٹ کے ماہرین کس امیدوار سے کیا کچھ سوالات پوچھیں گے، ہر امیدوار اسی تشویش میں تھا اور جب کوئی امیدوار انٹرویو ہال سے باہر آتا تو بقیہ امیدوار اس کے اردگرد جمع ہوجاتے، وہ اپنا حال بیان کرتا، کچھ کو تسلی ہوتی اور کچھ پریشان ہوجاتے۔ جب عادل کا نمبر آیا تو وہ خدا کا نام لے کر انٹرویو ہال میں داخل ہوا۔ شیخ الجامعہ ایک پُروقار اور متین شخصیت معلوم ہورہے تھے۔ سبجیکٹ ماہرین کے علاوہ گورنر کی جانب سے بھی ایک مشاہدہ کار موجود تھا۔ پچاس منٹ تک عادل کا انٹرویو ہوا۔ سبجیکٹ ماہرین شکل و صورت اور طرزِ تکلم سے مومنانہ معلوم ہورہے تھے۔ اس سے مشکل ترین سوالات پوچھے گیے، جن کا اس نے تسلی بخش جواب دیا۔ اس کی ذہانت، قابلیت اور علمی استعداد سے تمام سلیکشن کمیٹی کے ممبران حیران اور مطمئن ہوئے۔ کچھ دن کے بعد عادل کو یہ خوش خبری سننے کو ملی کہ اس کا سلیکشن ہوچکا ہے۔ وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سمایا۔

یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوشی کا دن تھا۔ پورے خاندان کے لوگوں نے اسے مبارک باد دینے کے ساتھ اس کا منھ میٹھا کروایا۔ موبائل فون، واٹس ایپ اور فیس بک پہ اس کے کئی دوست اور احباب نے اس کی کام یابی پہ خوشی کا اظہار کیا۔ پھر جس دن اسے آرڈر موصول ہوا تو اس کی ماں ہنستی مسکراتی ہوئی اس سے جھپٹ کے گلے ملی، لیکن عادل اس خوشی کے موقعے پہ رُوا ٹھا۔ ماں اپنے لختِ جگر کے آنسو دیکھ کر متحیر کُن لہجے میں پوچھنے لگی۔

"میرے جگر پارے ۔۔۔ میری آنکھوں کے تارے، رونا کس بات کا؟ یہ خوشی اور یہ آنسو۔ آخر کس بات پہ رونا آیا؟"۔ اتنے میں گھر کے تمام افراد آ کے عادل کے آس پاس ششدر سے کھڑے ہو گیے۔ سب حیران عادل کو ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگے۔ جب سب نے باری باری عادل سے ان کے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔

"مجھے اس بات پہ رونا آ رہا ہے کہ اس دنیا کے انٹرویو کے لیے مجھے کتنی مغز ماری کرنی پڑی۔ میں نے راتوں کی نیند حرام کی۔ انٹرویو ہال میں جانے سے پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھ سے کیا کچھ سوالات پوچھے جائیں گے۔ انٹرویو کس تاریخ کو ہے اور کہاں ہے؟ یہ تو انٹرویو کارڈ پہ درج تھا، لیکن مجھ سے کیا کچھ سوالات پوچھے جائیں گے، یہ نہیں لکھا تھا۔ یہ سوچ کے بھی رونا آیا کہ مرنے کے بعد قبر میں جو انٹرویو شروع ہوگا، وہ سوالات سب کو معلوم ہیں کہ فرشتے مجھ سے پوچھیں گے: بتا تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے؟ لیکن قبر کے انٹرویو کا وقت اور مقام کسی کو معلوم نہیں۔ مجھے قبر کی وحشت اور تاریکی یاد آئی۔ فرشتے یاد آئے۔ دنیا اور آخرت کا انٹرویو یاد آیا۔ ان تمام باتوں نے میرے اندرون کو ہلا کے رکھ دیا"۔

عادل کی باتیں سُن کر سب کے چہروں پہ مایوسی چھا گئی اور ہر ایک کو اپنی قبر کا انٹرویو یاد آ گیا۔